شیعہ سنی
قضیہ
کتنا مذہبی کتنا سیاسی؟
شکیل حسن شمسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"جب فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ہے تو بجز

کتاب

کوئی مونس و دمساز نہیں ہوتا۔

(امام جعفر صادقؑ)

شیعہ سنی قضیہ

کتنا مذہبی...... کتنا سیاسی؟

مصنف

شکیل حسن شمسی

عزاداری لبریشن فرنٹ کی پیشکش

نام کتاب: شیعہ سنی قضیہ کتنا مذہبی کتنا سیاسی؟

مصنف: شکیل حسن شمسی

قیمت: ۲۵ روپے

کمپیوٹر ٹائپ سیٹنگ: ارشد کمپیوٹر سینٹر نیو گنیش پارک رشید مارکیٹ دہلی ۵۱

طابع: ایس۔ ایس۔ انٹر پرائزز کوچہ چیلان دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ناشر: عزاداری لبریشن فرنٹ۔ جوہری محلہ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

ملنے کا پتہ: شمسی آرٹس جوہری محلہ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

۴۰۵۔ ٹیگور ہاسٹل منٹو روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تشکر: سید کلب نقی۔ شبر نظمی

اُن بے گناہوں کے نام جو شیعہ سنی فسادات

کا

شکار ہوئے۔

پیش لفظ

آج دنیا بھر کے مسلمانوں کو مختلف قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ افغانستان میں طالبان اور ربانی کی فوجیں بر سر پیکار ہیں تو الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ پر سرکاری فوجوں کا عتاب ٹوٹ رہا ہے۔ پاکستان میں مہاجروں پر ظلم ہو رہا ہے تو ہمارے یہاں فرقہ واریت کا اژدھا منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ لبنان اور فلسطین میں اسرائیل کی وحشیانہ پالیسیوں کا راج ہے تو دوسری طرف سر فہرست ہیں امریکا کی اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں..... ......ان ہی سازشوں کا ایک حصہ ہے شیعہ سنی نفاق کو ہوا دینا۔ اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تفرقہ پھیلانے والوں سے ہوشیار رہے اور مسلمانوں کو آپس میں لڑوانے کی کوشش کو ناکام کرنے کے لئے میدان عمل میں اترے۔

پاکستان میں مسجدوں کے اندر نمازیوں کو شہید کرنے والے لوگ کون ہیں؟ کیا بے گناہ عبادت گزاروں کو قتل کرنے والوں کو مسلمان کہا جا سکتا ہے؟ پاکستان میں سپاہ صحابہؓ اور سپاہ محمدؐ کے نام سے بنے دو انتہا پسند دہشت گرد گروہوں کو کیا ان حرکتوں کے پیش نظر صحابہؓ یا اہل بیتؑ کا تابع کہا جا سکتا ہے؟ کیا اسلام بے گناہوں کو قتل کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ کیا مسلکی اختلافات کی بنیاد پر کسی کو گولیوں سے بھون دینے کی اجازت ہمارے مذہب نے ہم کو دی ہے؟

اسلامی ممالک اس وقت امریکی سازشوں کے گھیرے میں ہیں اور ان حالات میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایسی کسی بات کو تقویت دینے کا سبب نہ بنیں جس سے امریکا اور اسرائیل کی پالیسیوں کو فائدہ پہنچے۔

آپ سب کو یاد ہوگا کہ امریکا نے ایران کے اسلامی انقلاب کو ختم کرنے کے لئے صدام حسین جیسے بعثی حکمراں کو زہریلے کیمیائی ہتھیار بنانے کی تکنیک فراہم کی خوب ہتھیار دئے تاکہ شیعہ سنّی کے نام پر عراق اور ایران کو آپس میں لڑوا کر دونوں کو کمزور کیا جا سکے۔اس زمانے میں مغربی میڈیا کی جانب سے صدام حسین کو ایک کٹر سنی مسلمان اور امام خمینی کو ایک متعصب شیعہ لیڈر بتا کر عوام کو گمراہ کیا جارہا تھا۔ لیکن دونوں ممالک کے بیچ لڑائی تھم جانے کے بعد صدام حسین نے جب اپنے عزائم کا انکشاف کویت پر حملے کے ساتھ کیا تو امریکا کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ پڑا اور وہی مغربی میڈیا جو کل تک صدام کو ایک راسخ العقیدہ سنّی مسلمان کا لقب دے رہا تھا ایک منٹ میں کافر اور بعثی کہنے لگا۔امریکا کے حلیف عرب ممالک جو کل تک صدام کی دامے درہمے اور سخنے مدد کر رہے تھے امریکا کی خواہش پر اپنی پاک سرزمین پر نجس فوجیوں کو دعوت عیش دینے لگے۔ صدام حسین پر امریکی ملہ سے معلوم ہوا کہ امریکا اور اسکے اتحادی خلیج میں کسی بھی مسلم ملک کو اسرائیل پر حاوی ہوتا دیکھ نہیں سکتے اور امریکا اپنی ناجائز اولاد اسرائیل کے تحفظ کے لئے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ جب تک عراق میں امریکا نواز حکومت نہیں آجاتی عراق کے عوام کو امریکا کے تھوپے ہوئے مصائب سے نجات نہیں مل سکتی۔

تصویر کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ ساری دنیا میں اسلامی انقلاب کی ایک لہر سی دوڑ رہی ہے جمال الدین افغانی، حسن النباء، قطب شہید، باقر الصدر شہید اور موسیٰ صدر جیسے شہیدوں کے انقلابی پرچم دنیا بھر کے اسلام پسند عناصر یکجا ہو رہے ہیں اور سوڈان سے لیکر مصر تک اسلامی انقلاب کی بازگشت سنائی دے رہی ہے بحرین سے لیکر سعودی عرب تک شاہی اور ایک ہی خاندان کی حکومت کے خلاف جمہوریت بحالی تحریکیں سر اٹھا رہی ہیں اور مسلمانوں کا

ایک ایسا گروہ سر ابھار رہا ہے جو مسلم ممالک میں اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتا ہے' اسی گروہ نے شیعہ سنّی منافرت کو بھی بڑی حد تک کم کیا ہے۔ ادھر ہندوستانی مسلمان آج فرقہ واریت' جہالت' غربت' کسمپرسی اخلاقی پستی اور نام نہاد قائدین کی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہیں اس عالم میں ان کے مسائل سے آنکھیں پھیر کر بعض علماء اور رہبران ملت ایسے مدرسے کھول رہے ہیں جہاں پر بچوں کو اسلام کی تعلیم کے نام پر مختلف اسلامی فرقوں کے بیچ فساد کروانے کی تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ لاکھوں روپے ایسی کتابوں پر صرف کیے جا رہے ہیں جو دوسرے فرقہ کے عقائد کو باطل اور اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر ثابت کرنے کے لئے لکھی جا رہی ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ دوسرے کو کافر کہہ کر کوئی بھی اپنے آپ کو مسلمان تو ثابت نہیں کر سکتا؟۔

اس صدی میں امام خمینی ایک ایسے واحد رہبر گزرے ہیں جنہوں نے خود کو مسلمان ثابت کرنے کے لئے کسی دوسرے کو کافر نہیں کہا۔ انہوں نے اپنے عمل اور طور طریقوں سے خود کو ایک سچا مسلمان ثابت کیا۔ ہندوستان کے علمائے خاندان اجتہاد کا بھی یہی طور طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے دوسرے مسلمانوں کو کافر کہنے کے بجائے خود کو ایک بہتر مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس میں ہی کامیاب بھی رہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے خاندان اجتہاد کی روایات کو برقرار رکھنے کی توفیق عطا کی اور اس کتاب کو لکھنے کا موقع عنایت کیا تا کہ مسلمانوں کے بیچ پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکے۔

میں نے اس کتاب میں تاریخ کے حوالہ لکھتے وقت غیر جانبدار رہنے کی پوری کوشش کی ہے اور عقیدہ کو تاریخ و تاریخ کو عقیدہ بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ میں نے ان اختلافی معاملات پر صرف روشنی ڈالی ہے جن کے سبب مسلمان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں ان پر بحث مباحثہ اور تکرار کرنے کی ضرورت قطعی نہیں سمجھی کیونکہ چودہ سو برس قبل جو واقعات ہوئے ان کو نہ تو آج بدلا جاسکتا ہے اور نہ ان پر بحث کر کے کسی نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے۔ میں نے اس کتاب میں ان سیاسی عناصر کی بھی نشاندہی کی ہے جنہوں نے اختلافات کو نفاق اور فساد میں

تبدیل کیااور میں اس نتیجہ پر بھی پہنچاہوں کہ یہ قضیہ مذہبی نوعیت سے زیادہ سیاسی اہمیت کا حامل رہاہے۔

اسلام میں اس وقت ۷۲ سے بھی زیادہ فرقہ ہیں اور یہ پھیلاؤ،گروہ بندی نہیں بلکہ اس بات کا غماز ہے کہ اسلام ایک جدید ترین اور وسیع النظر مذہب اور نظریاتی آزادی کی دولت سے مالامال دین ہے۔

میں نے گزشتہ آٹھ برس تک کتابوں کی ورق گردانی کے بعد یہ کتاب لکھی ہے اس کتاب میں کچھ خامیاں بھی ہوسکتی ہیں اس میں میری جہالت اور عدم معلومات کی جھلک بھی دکھائی پڑے گی مگر اس کتاب کے ہر لفظ میں ایک ہی درد چھپاہے اور وہ ہے مسلمانوں کی باہمی ایکتا اور آپسی اتحاد...... ان اوراق میں کچھ کڑوی سچائیاں بھی ہیں او تلخ تجربے بھی بہر حال میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے سچ بولنے کی ہمت عطا کی اور مسلمانوں کے مابین اتحاد قائم کرنے کی کوشش میں مجھے بھی ایک شمع جلانے کی سعادت نصیب کی۔

ضخیم کتابوں سے مجھے خود الجھن ہوتی ہے اس لئے میں نے اس کتاب کو کم سے صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور اسی خیال سے بہت سے معاملات پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے بجائے صرف چند جملوں میں ان کو نبٹا دیا ہے۔ مثال کے طور پر عرب میں عباسی اور اموی حکمرانوں کے مابین ہونے والی لڑائیوں فاطمیوں کی مصر میں حکومت چلانے کے دوران ابھرنے والے جھگڑوں ایران میں شیعیت کے نام پر پھر سے بادشاہت قائم ہوجانے کے بحث طلب موضوعات کو میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا تاکہ تاریخ کی بھول بھلیاں میں عام قاری کہیں کھو نہ جائے اور آسانی سے سمجھ لے کہ شیعہ سنی قضیہ کی مذہبی نوعیت کیا ہے؟ اور کس طرح سیاسی فوائد کے لئے خود غرض عناصر نے مختلف موقعوں پر اختلافات کو فساد میں تبدیل کردیا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اگر ان کو اس کتاب میں کوئی بات ایسی لگے جس سے کسی فرقہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے یا کوئی بات ان کو تاریخ کے حوالوں سے جدا لگتی ہے تو اس بارے میں خط ضرور لکھیں تاکہ آئندہ کے ایڈیشن میں اس خامی کو دور کیا جاسکے۔

امید ہے کتاب آپ کو پسند آئے گی اور آپ بھی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مسلکی اختلافات کی بحث سے اوپر اُٹھ کر مسلمانوں کے مابین اتحاد کی فضا ہموار کرنے میں اپنا کردار نبھائیں گے۔ والسلام

دعاؤں کا طالب
شکیل حسن شمسی
۴۰۵ ٹیگور ہاسٹل منٹو روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
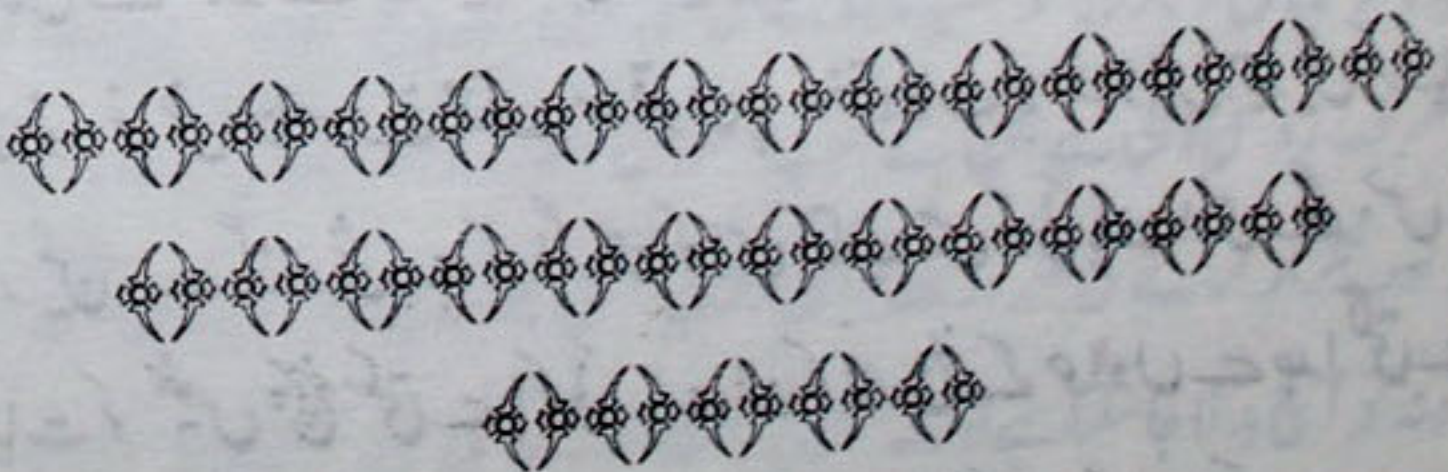
بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

فروغ اسلام

پیغمبر آعظم ختمی مرتبت ، رحمت اللعالمین ، فخر انبیاء ، حبیب خدا ، محبوب کبریا سرور کائنات حضرت محمد مصطفٰے نے اپنے معبود اور اس کائنات کے خالق کے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے دنیا کے تمام انسانوں کے لئے نجات کا سامان مہیا کرنے میں کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کیا اور کیسی کیسی عظیم قربانیاں دیں یہ بات دنیا کا ہر مسلمان جانتا ہے۔ صرف مسلمان ہی نہیں دنیا کے تمام مذہب کے لوگ رسول اللہؐ کو انسانیت کے نجات دہندہ کی شکل میں دیکھتے ہیں اور اکثر و بیشتر بڑے بڑے مدبر اس بات کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے کہ اسلام دنیا کا سب سے بہترین مذہب ہے۔ کچھ سر پھرے اور کم عقل لوگوں نے اسلام پر اکثر بیہودہ اور گھٹیا الزامات بھی لگائے مگر وقت نے ان کو خود ہی جھٹلا دیا۔ اس لئے اسلام دشمنوں نے اسلام کے خلاف اپنی مہم جاری رکھنے کے لئے مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں اور اختلافات کا سہارا لینا شروع کیا اور اس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی اور امّت مسلمہ کو اکثر سخت مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور و معروف مغربی مفکر نے یہ بھی کہہ دیا کہ "سب سے بہتر مذہب اسلام اور سب سے بدترین ملت مسلمان۔"

قرآن کریم کی اس واضح ہدایت کے باوجود کہ "آپس میں تفرقہ مت ڈالو اور اللہ کی

رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہو" ہم مسلمان تفرقہ اندازی سے باز نہ آئے اور اللہ کی رسی کے بجائے ہم نے کبھی ملائیت کی ڈور کو تھاما تو کبھی بادشاہت کی رسی کو سہارا بنایا۔

ہم نے قرآن و حدیث کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر اپنے فرقہ اور مسلک کے مفادات کو اہمیت دینا شروع کر دی ہم نے دنیا سے ذات پات رنگ و نسل کے بھید بھاؤ مٹانے کے بجائے خود پر عربی عجمی ہندی ترکی سندھی' بنگالی پنجابی اور بہاری کے لیبل لگالئے ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود کو اعلیٰ ذات اور پست ذات مسلمانوں کی دیواروں میں قید کر لیا۔ ہم پیشہ پر مبنی گروہوں میں بٹ گئے۔ قصاب تھے تو قریشی ہو گئے۔ حجام تھے تو سلمانی ہو گئے صفائی ستھرائی کا کام کرنے والے حسناتی ہو گئے بنکر صاحبان انصاری ہو گئے۔ یہی نہیں مغل پٹھان' مرزا' شیخ اور سادات......؟

جبکہ آخری حج سے لوٹتے وقت (۲۱ مارچ ۶۳۶ء میں) پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ نے کھلے الفاظ میں یہ بات کہہ دی تھی کہ اب تم سب آپس میں برابر ہو کسی کو رنگ و نسل ذات و قبیلہ کی بنا پر کوئی شرف یا افتخار حاصل نہیں ہاں اگر کسی کے لئے کوئی چیز باعث فخر و شرف ہے تو وہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے سوا کچھ نہیں۔

رسول اللہ نے اسی غدیر خم کے میدان میں موجود تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کے سامنے یہ بھی اعلان کیا کہ آج دین مکمل ہو گیا اور اللہ نے ان پر جو ذمہ داری عائد کی تھی اس کو وہ بخوبی پورا کر سکے۔

ہمارا ایمان ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ چالیس ہزار پیغمبر آئے مگر ان میں سے سوائے پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفےٰ کے علاوہ کوئی یہ دعویٰ نہ کر سکا کہ دین مکمل ہو گیا۔ شاید اللہ کی مرضی یہی تھی کہ آخری نبی کے دہن مبارک سے یہ الفاظ ادا کروا کے دنیا کو بتایا جا سکے کہ بس اسلام ہی حرف آخر ہے اور قرآن ہی اس کا آخری اور مکمل پیغام ہے۔

آج جبکہ دوسری آسمانی کتابوں کی نہ صرف زبان متروک ہو گئی بلکہ ان کے جاننے والے بھی بڑی مشکل سے ملیں گے، صرف قرآن کا ہی معجزہ ہے کہ اس کو پڑھنے والوں کی تعداد

چھاپا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کانگریس کے کئی رہنما شیعہ سنّی جھگڑے کو ہوا دینا چاہ رہے تھے۔ بیرسٹر صدیقی کہتے ہیں "موجودہ صورتحال کی ذمہ داری سنّیوں کے کانگریس نواز طبقہ پر عائد ہوتی ہے۔ سنّیوں کی دو مشہور و معروف درسگاہیں فرنگی محل اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں موجود ہیں مگر وہاں کے عالموں کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان سب ہی جھگڑوں کی جڑ مولوی عبدالشکور ہیں اور انھوں نے ہی اس قضیہ کو جنم دیا ہے۔ مولوی عبدالشکور نے اپنے اخبار کے ذریعہ مہینوں تک سنّیوں کو بھڑکایا اور تشدد کو ہوا دی جس کے بعد شیعوں کو بھی ان کے مقابلے میں آنا پڑا"۔ بیرسٹر صدیقی آگے کہتے ہیں تاریخ میں مدح صحابہ پڑھے جانے کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے یہ سب مولانا عبدالشکور کے دماغ کی پیداوار ہے انھوں نے مدح صحابہ کو فرض (واجب) قرار دے دیا ہے۔ پھر ان کی مدد کو احرار پارٹی کے صدر مولانا حسین احمد مدنی آگئے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ احرار پارٹی کانگریس کی پٹھو ہے کانگریس پارٹی نے اس ڈر سے کہ کہیں احرار پارٹی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے مدح صحابہ کے جلوس کی اجازت والا حکم نامہ جاری کر دیا"۔

یوپی کی پروزنل گورنمنٹ کی طرف سے مدح صحابہ کی اجازت مل جانے سے سنّی نہایت مسرور تھے تو شیعہ ناراض اور غیر مطمئن شیعوں نے جواب میں تبرہ ایجیٹیشن کے نام سے ایک تحریک شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔

تبرہ کیا ہے؟

عربی میں برہ لفظ کا استعمال ہٹو، چلو یا دفع ہو جاؤ کے معنی میں آج بھی کثرت سے ہوتا ہے تبرہ کا مفہوم ہے الگ ہٹ کر چلنا یا پیروی نہ کرنا اظہار بیزاری وغیرہ وغیرہ لیکن تبرہ کا کہیں بھی یہ مطلب نہیں لکھا ہے جو گالیاں دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہو۔ ابتداء میں شیعوں میں تبرہ کے یہی معنی رائج تھے کہ خلفائے ثلاثہ کی پیروی نہ کرنا اور دشمنان اہلبیت سے اظہار بیزاری کرنا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب گزشتہ لکھنؤ میں تبرہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب تک تبرہ

کا مفہوم دشمنان آل محمد سے اظہار برائت تک محدود تھا تو سنی بھی شیعوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے لیکن جب خلفائے ثلاثہ کو بھی دشمنان آل محمد کی فہرست میں جوڑ دیا گیا تو سنّی الگ ہو گئے۔ بعد میں تبرہ کا مطلب بھی بدل دیا گیا اور گالی دینے اور لعنت ملامت کرنے یا سب و شتم کو تبرہ سمجھا جانے لگا جبکہ تبرہ کے یہ معنی ہر گز نہیں ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیعہ مذہب میں کسی کو گالیاں دینے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت علی تو سب و شتم کے اتنے زیادہ خلاف تھے کہ جنگ صفین کے موقع پر جب امیر معاویہ کی جانب سے حضرت علی پر سب و شتم شروع ہوا تو جواب میں حضرت علی کے کچھ سپاہیوں نے بھی امیر معاویہ پر سب و شتم کرنا چاہا تو حضرت علی نے ان لوگوں کو روکتے ہوئے فرمایا "میں تمہارے لئے اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ تم گالیاں دینے لگو اگر تم ان کے کرتوت کھولو اور ان کے صحیح حالات پیش کرو تو یہ ایک ٹھکانے کی بات ہوگی اور عذر تمام کرنے کا صحیح طریق کار ہوگا۔ تم گالم گلوج کے بجائے یہ کہو کہ خدا ہمارا خون بھی محفوظ رکھ اور ان کا بھی اور ہمارے اور ان کے درمیان اصلاح کی صورت پیدا کر اور انہیں گمراہی کی طرف سے ہدایت کی طرف لا تا کہ حق سے بے خبر حق کو پہچان لیں۔ اور گمراہی اور سرکشی کے شیدائی کی اس سے اپنا رخ موڑ لیں" (نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۴ صفحہ ۵۷۱)

حضرت علی کے برعکس امیر معاویہ نے سب و شتم و اہلبیت اطہار کی شان میں گستاخیوں کو خوب بڑھاوا دیا اور حضرت علی پر منبروں سے سب و شتم کئے جانے کے لئے چالیس ہزار افراد کو کرائے پر کر رکھا۔ امیر معاویہ نے حضرت علی کی شہادت کے بعد مسند خلافت کو شاہی میں تبدیل کر دیا تھا اور مطلق العنان طرز حکومت کو رائج کر دیا تھا اسی لئے مسلمانوں کے کسی بھی فرقہ نے امیر معاویہ کو اسلامی خلیفہ کا درجہ نہیں دیا اور سنّیوں نے بھی خلافت راشدہ کا اختتام حضرت امام حسن کی صلح پر ہی تسلیم کیا ہے۔ چونکہ سب و شتم اور گالم گلوج بادشاہی کے دماغ کی پیداوار تھا اس لئے جب شیعوں کے ایک طاقتور طبقہ کو حکومت ملی اور اس نے اسلامی نظام کی جگہ شاہی نظام کو اختیار کیا تو اس نے بھی اپنے دل کی کدورت اور بغض و عداوت مٹانے کے

لئے گالم گلوج کا سہارا لیا۔ اس طرح تبرہ اپنے اصل معنوں میں نہ رہ کر دوسرے رنگ روپ میں دنیا کے سامنے آیا۔ جبکہ تاریخ گواہ ہے شیعوں کے کسی امام نے یا اہلبیت پاک کے کسی ایک بچے نے بھی کسی کو سب و شتم کا نہ تو نشانہ بنایا نہ اس کو پسند کیا یہ لوگ تو وہ عظیم لوگ تھے جو اپنے قاتل کو بھی شربت پیش کرتے تھے۔

تبرہ کی تحریک

ضد بحث اور ایک دوسرے کے عقائد پر چوٹ لگانے کی روش نے ۳۰ مارچ ۱۹۳۹ء میں بالکل نئی شکل اختیار کی سنّیوں کو مدح صحابہ کا جلوس دیئے جانے کے خلاف شیعوں نے تبرہ ایجیٹیشن شروع کر دیا۔ تحریک کے دوسرے ہی دن سنّیوں نے ہنگامہ کر دیا اور پولیس کو گولی چلانا پڑی مگر شیعوں کی تحریک کمزور پڑنے کے بجائے روز بروز ہوتی گئی۔ روز بڑے امام باڑے سے شیعہ تبرا پڑھ کر گرفتاری دیتے اور اس قبل جلسہ ہوتا جلسوں میں جوشیلے اور جذباتی مقررین تقریریں کرتے۔ اس جلسوں میں بہت سے ہندو عمائدین بھی شرکت کرتے ہندوؤں کی طرف سے حمایت ملنے کے سبب جوشیلے شیعہ نیتا شبیر حسن قتیل نے کہا کہ "ہم اپنے جلسوں میں شامل ہونے والے ہندوؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ہم ہندوستان میں بھائی چارہ اور خیر سگالی بڑھانے کی غرض سے گاؤکشی کی بھی مخالفت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے" ادھر تو شیعوں کا جوابی تبرہ AGITATION چل رہا تھا اور دوسری طرف کانگریس سرکار نے ۳ مئی ۱۹۳۹ء کو عید گاہ عیش باغ سے مدح صحابہ کا جلوس اٹھوایا جو چار باغ کے میدان میں ختم ہو گیا۔

مولانا آزاد کی مداخلت

شیعوں کی تحریک تبرہ میں پنجاب اور سندھ سمیت مختلف صوبوں سے کثیر تعداد میں کارکن آرہے تھے اور حالت یہ تھی کہ بعض صوبوں سے تو تبرہ اسپیشل کے نام سے پوری پوری ٹرین بھر کر شیعہ حضرات خود گرفتاری کے لئے پیش کرنے آرہے تھے۔ ۱۸ ہزار شیعوں نے خود گرفتاری کے لئے پیش کر کے برٹش سرکار کے لئے ایک بڑا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا دوسری طرف

مسلم لیگ لکھنؤ کے حالات کے لئے کانگریس کو ذمہ دار ٹھرا رہی تھی۔ کانگریس نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا کر مولانا ابوالکلام آزاد کو اس قضیہ میں مداخلت کے لئے لکھنؤ بھیجا مولانا نے شیعہ لیڈر شپ سے خوشگوار ماحول میں بات کی اور آخر کار شیعوں نے ۳۱/ اگست ۱۹۳۹ء کو اپنی تحریک دو ہفتہ کے لئے ملتوی کر دی۔ گفت وشنید کا سلسلہ شروع ہو گیا مگر دوسری جنگ عظیم کا بگل بھی بجنے لگا ۱۶/ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر اور روس کی فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ اور ۱۹/ اکتوبر سے دوسری جنگ عظیم شروع بھی ہو گئی۔

ادھر خاکسار تحریک بھی عروج پر تھی اور برٹش سرکار اور خاکسار تحریک کے کارکنوں کے بیچ روز روز جھڑ پیں ہو رہی تھیں بہر حال مولانا ابوالکلام آزاد نے شیعوں سے مذاکرات کا دور پورا کرنے کے بعد ۲۸/ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کیا کہ بارہ وفات کا جلوس سنّیوں کا مذہبی حق نہیں ہے اور سنّیوں کو اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن سنّی اپنے اپنے گھروں میں مدح صحابہ کر سکتے ہیں۔ اس اعلان سے سنی بگڑ گئے ۲۹/ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو سنیوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عظیم مدبر کو غدار سنّی کے لقب سے نوازا گیا۔

ایک اور فساد

یکم نومبر ۱۹۳۹ء کو پاٹانالہ سے گزرنے والے ۱۸/ رمضان کے جلوس کو لیکر پھر تناؤ ہو گیا کیونکہ پاٹانالہ کے علاقہ میں مولانا عبدالشکور کے اشارے پر لال پیلی جھنڈیوں پر خلفائے ثلاثہ کے نام لکھ کر پورے علاقہ کو سجایا گیا تھا۔ شیعوں نے اس پر اعتراض کیا اور جلوس کو پولیس چوکی کے پاس ہی احتجاجاً روک دیا۔ بعد میں پولیس نے جھنڈیاں اتروادیں اور دوسرے دن صبح کو جلوس آگے بڑھا تو چھتوں پر سے سنّیوں نے پتھراؤ کر دیا کئی لوگ بعد میں چاقوزنی کے واقعات میں آس پاس کے علاقوں میں قتل کئے گئے۔

۳۰ نومبر ۱۹۳۹ء کو سرکار نے ان جلوسوں کو اٹھوایا جو تحریک تبرّہ اور فسادات کی وجہ سے اٹھنے سے رہ گئے تھے ان جلوسوں میں فساد نہیں ہوا یکم دسمبر کو چپ تعزیہ کا جلوس اٹھوایا گیا

لیکن شہر میں بدامنی اس قدر بڑھ چکی تھی اور بیروزگاری اور مہنگائی سے شہری اس قدر پریشان تھے کہ ۶ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ کے شریف شہریوں نے رانی گنج کا مارکیٹ اور ۷ دسمبر کو وکٹوریہ گنج کا غلہ بازار لوٹ لیا۔ دوسرے دن بخاری ٹولہ میں بم بھٹا جس میں کئی بچے اور ایک عورت زخمی ہوئی ۲۲ دسمبر کو برٹش سرکار نے یوپی کی عبوری سرکار کو برخاست کر دیا۔ مسلم لیگ نے اس دن یوم نجات منایا تو ٹیلہ والی مسجد کے احاطہ میں احرار پارٹی نے یوم غم منایا۔ دونوں فرقوں کے بیچ اس زمانے میں اخبار بازی شروع ہو گئی اور ایک دوسرے ہر الزام تراشیاں اور عقائد کا مضحکہ اڑانے کا سلسلہ شروع ہو گیا شیعوں کی طرف سے ذوالفقار 'نظارہ اور دوسرے اخبار تھے جبکہ سنیوں کی طرف مسماۃ حرم اور نقارہ جیسے اخبار ایک دوسرے کے خلاف جم کر لکھ رہے تھے۔

مدح صحابہ کی اجازت منسوخ

۱۰ اپریل ۱۹۴۰ء کو شیعوں نے مولانا آزاد کے وعدہ کو پورا نہ کئے جانے کے خلاف پھر سے تحریک تبرّہ شروع کرنے کی دھمکی تو برٹش سرکار نے مولانا آزاد کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ۱۹ اپریل ۱۹۴۰ء کو مدح صحابہ کے جلوس کی اجازت کو منسوخ کر دیا سرکاری حکم کے پہلے حصہ میں لکھا تھا کہ "یوپی کی سرکار نے ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو جو حکم نامہ جاری کیا تھا وہ حالات کے غلط اندازوں پر مبنی تھا اور یہ فیصلہ غلط تھا" حکم نامہ کے دوسرے حصہ میں تحریر تھا "سنّیوں کو اپنے خلفاء کی تعریف و توصیف کا پورا پورا حق ہے اور ان کے اس حق کو نہ تو چنوتی دی جا سکتی ہے نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے لیکن مدح صحابہ کے جلوس کی نوعیت الگ ہے کیونکہ یہ ۱۹۰۵ء کے شیعہ سنّی قضیہ کے بعد اٹھا ہے اس جلوس پر شیعوں کو اعتراض ہے اور حقیقت میں یہ سنّیوں کے مذہب کا حصہ بھی نہیں ہے۔"

اس اعلانیہ میں سنّیوں کو اپنے گھروں میں مدح صحابہ کرنے کا حق تسلیم کیا گیا تھا تو شیعوں کو بھی گھروں میں تبرّہ کرنے کا حق مل گیا لیکن دونوں کو جلوس نہیں ملے۔ دو دن کے بعد سنّیوں نے سرکاری حکم کی خلاف ورزی کر کے ۲۱ اپریل ۱۹۴۰ء کو مدح صحابہ کا جلوس نکالا اور

شیعوں نے بھی تبرہ کا جلوس نکالا جس کے بعد شدید فساد پھوٹ پڑا دس لوگ اسی دن کے فساد میں مارے گئے اور کئی بعد میں اسپتال میں دم توڑ گئے۔ مگر اس فساد کے بعد بہت دنوں تک شہر میں امن و امان رہا کیونکہ سرکار نے بھی سختی برتنا شروع کر دی تھی ہر برس بارہ وفات کے موقع پر سرکار مدح صحابہ کے جلوسوں پر پابندی عائد کر دیتی اور اس طرح دن یہ آرام و سکون کے ساتھ گزر جاتا حقیقت میں شیعہ لیڈر شپ نے سنّیوں کے قائدین کو کراری مات دے دی تھی۔ شیعوں کی اس فتح میں ان کی لیڈر شپ کے اتحاد کا بہت بڑا ہاتھ ویسے بھی مولانا ابولکلام جیسے مدبر اور اونچے قد کے مسلم رہنما کے سامنے مولانا عبدالشکور کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ مولانا عبدالشکور صرف ایک خاص گروہ کے لیڈر تھے اور شیعوں کی طرف سے تبرہ بازی کئے جانے کے سبب ان کو کچھ کامیابی و شہرت مل بھی گئی تھی ورنہ فرنگی محل کے علماء کے سامنے ان کی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مولانا عبدالشکور نے مسلمانوں کو آپس میں خون خرابے پر اکسا کر اسلام کی کتنی خدمت کی اس سے تو آج سب ہی واقف ہیں لیکن شیعوں کی دشمنی میں انھوں نے خاندان رسالت کی جتنی توہین کی ہے اور مسلمانوں کو تقسیم کرنے والے جتنی کتابیں لکھی ہیں اللہ تعالی اس کے لئے ان سے ضرور باز پرس کرے گا۔

شیعوں میں پھوٹ

۱۹۴۱ء کے بعد مدح صحابہ کا قضیہ صرف پاٹانالہ کی گلیوں تک محدود رہ گیا لیکن شیعوں اور سنّیوں کے بیچ کتابوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی جاری و ثاری تھی شیعوں کے عالم دین کی جانب سے اگر قاتلان حسین کا مذہب کے نام سے کتاب لکھی جاتی تو سنّی اس کے جواب میں قاتلان حسین کی خانہ تلاشی کے نام سے دوسری کتاب لکھتے۔ مگر ۱۹۴۱ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ اپنے اتحاد و اتفاق کی بنیاد پر تحریک تبرّہ جیسا معرکہ سر کر لینے والی قوم دو حصوں میں بٹ گئی۔ دراصل امام حسین کی شہادت کو ۱۹۴۲ء مطابق ۱۳۶۱ء کو ۱۳سو سال پورے ہو رہے تھے اس سلسلے میں شیعہ علماء نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ امام حسین کی شہادت کے سلسلے

میں ایک جامع و مفصل کتاب شائع کی جائے تا کہ دنیا کے تمام مذاہب کے لوگ آسانی سے مقصد شہادت کو جان سکیں۔ کافی وقت کے گزر جانے کے بعد جب کسی عالم دین نے کوئی کتاب نہیں لکھی تو مولانا سید علی نقی عرف نقن صاحب نے شہید انسانیت کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس کی کاپیاں مختلف علماء اور دوسرے لیڈروں کو رائے جاننے کے لئے بھیجیں مگر علماء اور قائدین کے ایک گروہ نے اس کتاب پر اعتراضات کرنے کے بجائے مولانا نقن صاحب کے خلاف ایک بھرپور مہم چھیڑ دی اور خاندان اجتہاد پر کیچڑ اچھالنے کا کام شروع کر دیا۔ اس مہم کے نتیجہ میں شیعہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی اور حالات اس مقام پر پہنچ گئے کہ مجلسوں میں خود شیعہ ہی پتھر پھینکنے لگے۔

ہندوستان کی تقسیم

پاکستان بننے میں شیعہ قائد محمد علی جناح کی سیاست اور راجہ محمود آباد کی دولت نے جو رول ادا کیا تھا اس سے تو سب ہی واقف ہیں لیکن کئی شیعہ علماء اور شیعہ کانفرنس پاکستان بننے کے حق میں نہیں تھے۔ خاندان اجتہاد کی طرف سے شائع ہونے والے سحاب، نظارہ، اور سیارہ جیسے اخبار پاکستان بننے کی مخالفت کر رہے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ملک کی تقسیم سے مسلمان کمزور پڑ جائیں گے مگر ہونی کو کون ٹال سکتا تھا ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آگیا۔ اس تقسیم کے نتیجہ میں لاکھوں بے گھر ہوئے لاکھوں فسادات میں مارے گئے دہشت اور خوف کے ماحول نے ایسا رنگ دکھایا کہ راتوں رات ہزاروں لوگ اپنے گھروں کو کوڑیوں کے مول بیچ کر یا پھر خالی چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر گئے۔

لکھنؤ میں نوابی ختم ہو جانے کے بعد شیعوں کے پاس زمینیں تھیں بڑے بڑے مکان تھے جائدادیں تھیں مگر پاکستان بننے کے بعد ہزاروں لوگ اس طرح گھر چھوڑ گئے کہ محلّہ کہ محلّہ ویران ہو گئے۔ فسادات، اور ملک کے حالات، بیروزگاری اور وقت کے ساتھ نہ چلنے والی روش

کے سبب شیعوں کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔

ہندوستان کا آئین

۱۹۵۰ء میں ہندوستان میں نیا آئین بنا تو اس میں سب کو اپنے اپنے مذہب پر عمل درآمد کی آزادی ملی اور کسی کو دوسرے کے مذہب پر کیچڑ اچھالنے کا حق نہیں دیا گیا۔ اس آئین کے روشنی میں ۱۹۵۳ء میں قاری صدیق نے الہ آباد ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی اس رٹ میں سنیوں کو مدح صحابہ کا حق تو ملا لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی طرف سے جلوس کو دفعہ ۱۴۴ کے تحت بند کرنے کو "قانوناً حق بجانب قرار دیا گیا۔ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے بعد بہت دن تک معاملہ دبا رہا لیکن گھروں مسجدوں اور امام باڑوں میں محفلیں اور میلاد ہوتے رہے جہاں سے ایک دوسرے کے خلاف جملہ بازیاں جاری رہیں۔ تقریباً نو برس بعد شیعہ سنّی قضیہ نے پھر نے رنگ پکڑا جب نخاس کی ایک تبرائی محفل سے واپس جاتے وقت پل غلام حسین پر ایک شیعہ نوجوان بادشاہ حسین کو قتل کر دیا گیا۔ دوسرے دن شہر میں زبردست کشید گی تھی اور تقریباً ۲۰ ہزار شیعہ میڈیکل کالج کے پوسٹ مارٹم روم کے آگے جمع تھے سب کو امید تھی کہ جھگڑا ضرور ہوگا لیکن مولانا کلب عابد صاحب مرحوم کی تقریر اور صبر کی تلقین نے شیعوں ایسا اثر کیا کہ پورا مجمع خاموشی سے جنازہ کے ساتھ چلتا رہا اور کچھ بھی نہ ہوا۔

جھنڈے کی اجازت

دو سال بعد سنّیوں کے زبردست دباؤ میں آکر ۱۹۶۵ء میں ضلع حکام نے شہر سے بارہ کلومیٹر دور کالے پہاڑوں پر سنّیوں کو جھنڈا اٹھانے کی اجازت دے دی لیکن شیعوں کی اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی اس لئے وہ جوابی کاروائی نہ کر سکے۔ ۱۹۶۶ء میں سنّیوں نے پھر کالے پہاڑوں پر مدح صحابہ کا جلوس اٹھایا اور شیعوں نے ملکہ کشور کی مسجد سے تبرہ کا جوابی جلوس اٹھایا مگر کہیں جھگڑا نہیں ہوا۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء تک آپسی کھینچا تانی بھی چلتی رہی اور ایک دوسرے کو چڑھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۶۹ء میں غلام حسین کے پل والی چاریاری مسجد کے چھجہ پر نہ

صرف خلفاء کے نام لکھ دیئے گئے بلکہ کچھ اور صحابہ کے نام بھی تحریر کر دیئے گئے۔

شیعہ قیادت کی غلطی

مسجد کے چھجہ پر نام لکھے جانے کے معاملہ کو شیعہ لیڈر شپ نے ایک نیا مسئلہ بنا دیا اور اس بات پر ضد کرنا شروع کی کہ مسجد پر سے چار یار کے نام مٹائے جائیں۔ ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء کو ناظم صاحب کے امام باڑے میں وداعی علم کی مجلس منعقد ہوئی جس میں شیعہ لیڈر مولانا طاہر جرولی صاحب اور اشرف حسین ایڈوکیٹ نے کافی اشتعال انگیز تقاریر کیں۔ اس کے بعد تقریباً ۲۰ ہزار شیعوں پر مشتمل جلوس اکبری گیٹ سے غلام حسین کے پل ہوتا ہوا ستم نگر کے لئے روانہ ہوا سنّیوں کا کہنا ہے کہ جلوس کے شرکاء کو تبرے پر اکسایا گیا اور جلوس والوں نے تبرہ بازی کی جب کہ شیعہ اس سے انکار کرتے ہیں۔ بہر حال سنی اس رات کو تو تبرہ بازی سہہ گئے لیکن دوسرے دن یعنی ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کو سنّیوں نے منصوبہ بند طریقے سے ایک چھوٹے سے جلوس پر حملہ کر کے دو شیعوں کو قتل کر دیا بعد میں کاظمین اور کشمیری محلّہ کے شیعہ بھی جھگڑے پر آمادہ ہو گئے خوب جم کر فساد ہوا۔ منصور نگر کے ایک سنّی تاجر کے گھر سے گولی چلائے جانے کے واقعہ میں دو شیعہ نوجوان قتل ہوئے یہ فساد اس قدر منصوبہ بند پیمانے پر ہوا تھا کہ پل غلام حسین کے فساد کے چند ہی لمحوں بعد غفران مآب اور آغا باقر کے امام باڑوں کو پھونک دیا گیا اور اس کے آس پاس کے کئی باشندوں کو بھی تاراج کیا گیا کئی لوگ شدید طور پر زخمی ہوئے۔ اس کے علاوہ سید تقی صاحب کا امام باڑہ اور وہاں کی قدیم لائبریری بھی جلادی گئی جس میں بیش قیمت اسلامی کتابیں قلمی مسودہ اور قرآن مجید کی ان گنت کاپیاں موجود تھیں۔ محراب و منبر کو تاراج کرنے کے ساتھ ساتھ خود مسلمانوں نے ہی قرآن کو پھونک دیا۔

ایک یادگار واقعہ

۲۶ مئی ۱۹۶۸ء کے فساد میں ہمارے گھر سے جلتے ہوئے مکانوں کا دھواں نظر آرہا ہے تو کبھی شعلہ دکھائی پڑ رہے تھے جب امام باڑہ غفران مآب اور اس کے پاس کے مکانوں میں آگ لگائی

گئی تو یہ طے نہیں ہو پا رہا تھا کہ آگ غفرانماب کے امام باڑے میں لگی ہے یا باقر حسین صاحب کی لکڑی کی ٹال جل رہی ہے۔ اس بات کی تصدیق کرنے کے لئے میں گھر سے خاموشی سے نکل گیا اسی وقت میری عمر صرف ۱۳ یا ۱۴ سال تھی جب میں امام باڑے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ امام باڑہ جلانے والی بھیڑ میں ہمارے محلہ کے ہی وہ کہار بھی شامل ہیں جو نہ جانے کتنے برسوں سے ہم لوگوں کی دی ہوئی جگہ پر رہتے تھے اور ہمارے گھر کی پردہ دار عورتوں کو ڈولی اور پالکی کے ذریعہ ایک محلہ سے دوسرے محلہ تک لے جانے کا کام کرتے تھے۔

فسادیوں نے جب مجھے دیکھا تو میری طرف لپکے میں گھبراہٹ میں ایک سنّی دودھ فروش حاجی چنا کے گھر میں گھس گیا جنھوں نے نہ صرف مجھے بچایا بلکہ کئی گھنٹوں تک اپنے گھر میں پناہ دی اس کے چار گھنٹے کے بعد جب میرے چچا شہریار عزمی، نواب افسر حسین ایڈوکیٹ اور کربلائی نواب صاحب پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی پڑے تو حاجی چنا نے مجھے ان کے حوالے کیا۔ مگر اس حادثہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حاجی چنا کو بھی امام باڑہ جلانے والوں کی فہرست میں ڈال کر تقریباً ایک مہینہ تک جیل میں رکھا گیا۔

اس فساد سے تقریباً دو برس قبل سے ہی سیاسی پارٹیاں دونوں فرقوں کی کھینچا تانی میں لگی ہوئی تھیں۔ جن سنگھ شیعوں کو دانہ ڈال رہی تھی تو کانگریس سنّیوں کی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ شیعہ حضرات کانگریس سے اس قدر چڑھے ہوئے تھے کہ ۱۹۶۷ء کے انتخابات میں انھوں نے سید علی ظہیر جیسے شیعہ لیڈر کو ووٹ نہیں دئے بلکہ جن سنگھ کے لالو شرما کو ووٹ دئے اور جتوایا۔ ۱۹۶۹ء کے درمیانی مدت کے انتخابات میں کانگریس نے فرنگی محل کے نامور عالم دین مفتی رضا انصاری کو میدان میں اتارا مگر اس بار کا الیکشن مذہبی بنیادوں پر نہیں صرف سیاسی حالات کے تحت انجام پایا اور لکھنؤ یونورسٹی کے سابق صدر ڈی پی بورا کامیاب رہے۔

لیکن ۲۶ر مئی ۱۹۶۹ء کے فساد کے بعد شیعوں کا ایک گروہ پوری طرح سے جن سنگھ کی جھولی میں چلا گیا۔ کئی شیعہ پیلی ٹوپی لگا کر گھومنے لگے شیعوں کے جلسے میں بلراج مدھوک اور ناناجی دیش مکھ جیسے جن سنگھی رہنما تقریریں کرنے کے لئے آنے لگے۔ ڈاکٹر پی ڈی کپور کا تو

میں روز بروز اضافہ ہوتا ہی جارہا ہے اور عربی زبان بھی دنیا کے گوشے گوشے میں صرف قرآن مجید کے طفیل بولی اور سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے قرآن پڑھنے کو صرف ایک مقدس فریضہ تک ہی محدود کرلیا ہے اس پر عمل کرنا یا اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا بند کردیا ہے۔ اگر سب مسلمان قرآن کے احکامات پر صدق دل سے عمل کرتے ہوتے تو آج ان کو اتنی پریشانیاں نہیں اٹھانا پڑتیں اور امت مسلمہ کو اس طرح در بدر کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑتیں۔

غدیر خم کے میدان میں پیغمبر خدا نے آخری بار مسلمانوں کو متحد رہنے کا اور آپس میں بھائی چارہ بنائے رکھنے کا پیغام دیا تھا اور یہیں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "من کنت مولہ فھٰذا علی مولا" یعنی جس کا میں مولا ہوں یہ علی بھی اس کے مولا ہیں۔ اس موقع پر بہت سے صحابیوں نے حضرت علی کو بڑھ بڑھ کر مبارکباد دی مبارکباد دینے والوں میں حضرت عمر خطاب بھی شامل تھے اور دوسرے جلیل القدر صحابی بھی اس واقعہ کے صرف سوا دو مہینے بعد رسول اللہ پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفیٰ نے ۲۷ مئی ۶۳۲ء میں اپنے خالق حقیقی کی جانب سفر اختیار اور اس دنیا سے ان کی روح پرواز کر گئی تو ساری امت مسلمہ رنج واندوہ کے عالم میں ڈوب گئی۔ پیغمبر پاک کے گھر کے افراد ہی نہیں تمام برگ و شجر اور اور چرند و پرند تک رنج والم کے سمندر میں غرق تھے۔ مدینہ کا ہر گھر ماتم کدہ تھا اور ہر آنکھ اشکبار تھی اس رنج والم کے ماحول میں پیغمبر خدا کی تدفین کی تیاری شروع ہوئی۔ گھر کے اندر خاندان بنو ہاشم کے لوگ دفن و کفن کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے تو باہر اصحاب باوفا کا ایک ہجوم تھا۔ اسی بیچ خبر آئی کہ ثقیفہ بنی ساعدہ میں سینکڑوں مسلمان جمع ہیں اور پیغمبر اسلام نے جو سلطنت چھوڑی ہے اس کے لئے خلیفہ چن رہے ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ کے گھر کے باہر جمع اصحاب بھی ثقیفہ بنی ساعدہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ثقیفہ میں موجود لوگ ابو عبیدہ بن جراح کو اپنا خلیفہ مان کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ مگر حضرت عمر نے اس کی مخالفت کی اور حضرت ابو بکر کو خلیفہ مقرر کئے جانے کو کہا جس کو وہاں پر موجود مسلمانوں نے تسلیم کرلیا۔

شیعوں میں پہلے ہی سے اٹھنا بیٹھنا تھا اس فساد کے بعد وہ شیعوں کے اور زیادہ قریب آ گئے۔ ہفتہ وار آرگنائزر نے ۱۲ جولائی ۱۹۶۹ء کی اپنی اشاعت میں لکھا ہے "اگر جن سنگھ نے وقت پر مداخلت اور مدد نہ کی ہوتی تو لکھنؤ کے شیعوں کو ختم کر دیا گیا ہوتا لکھنؤ کا فساد بھارت کے شیعوں کے خلاف رچی جا رہی سازش کا پہلا قدم تھا چونکہ لکھنؤ بھارت کے شیعوں کا مذہبی مرکز ہے اس لئے لکھنؤ پر پہلا وار کیا گیا کہ دوسرے علاقوں میں رہنے والے شیعوں کو نفسیاتی طور پر دہشت زدہ کیا جا سکے اور وہ ناامید اور مایوس ہو کر گھبرا جائیں" ایک طرف تو شیعہ فرقہ کے کچھ لوگ جن سنگھ کی ٹوپی پہنے گھوم رہے تھے تو دوسری طرف شیعہ کانفرنس کے صدر ابو محمد زیدی اور ان کے ساتھی بمبئی سے جن سنگھ کی طرف شیعوں کو لے جانے کی کوششوں کے خلاف پمفلٹ اور پوسٹر چھاپ کر مخالفت کر رہے تھے۔

۱۹۶۹ء میں ۱۹ جون کو مولوی گنج کے اصطبل چار باغ علاقہ میں ایک شیعہ مسجد میں نو چندی کا علم اٹھانے کے لئے کئی شیعہ حضرات اپنی قیادت کے جانب سے کسی واضح اعلان کے نہ ہونے کے سبب اکٹھا ہو گئے جس کے بعد سنّیوں نے حملہ کر دیا اور دو شیعہ ہلاک ہوئے بعد میں پولیس فائرنگ ہوئی اور کئی لوگ زخمی ہوئے۔ مگر اس وقت کے وزیر اعلی سی بی گپتا نے ایک نہایت جرائت مندانہ قدم اٹھایا انھوں نے شیعوں اور سنّیوں کے لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا اور کہا کہ جب آپ لوگ کوئی معاہدہ کر لیں گے تب ہی باہر آ سکیں گے۔ الغرض ۱۹۶۹ء میں دونوں فریقوں کے بیچ سمجھوتہ ہوا اور یہ طئے پایا کہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔

معاہدہ ٹوٹا

۱۹۷۴ء میں ۱۵ مارچ کو چہلم تھا صبح سے دوپہر تک حالات ٹھیک تھے۔ دوپہر کو کشمیری شیعوں کا قدیم علم مقبرۂ عالیہ گولا گنج سے بر آمد ہو کر پاٹا نالہ کے علاقہ میں پہنچا یہ جلوس وہی نوحہ پڑھ رہا تھا جس پر سنّیوں کو ہمیشہ سے اعتراض تھا اور جلوس کے شرکاء بھی نوحے کے تمام مصرعوں کو چھوڑ کر وہی مصرعہ بار بار دہرا رہے تھے جس پر سنّیوں کو اعتراض رہا ہے۔ اچانک پتلی

سی گلی میں چھتوں پر سے خشت باری شروع ہو گئی اور بھگدڑ مچ گئی گلی سے باہر نکل کر جلوس والوں نے خوب جم کر لوٹ پاٹ کی اور توڑ پھوڑ کی اس فساد میں سنّی فرقہ کا جانی نقصان بھی زیادہ ہوا۔ اس جھگڑے میں تقریباً پندرہ آدمی ہلاک ہوئے۔ اس وقت صوبہ میں ہیم وتی نندن بہوگنا کی حکومت تھی انھوں نے ایک ہی دن میں فساد پر قابو پالیا اور صرف ۱۸ دن کے اندر ہی چپ تعزیہ کا جلوس پر امن طور پر نکلوا کر لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔

بعد میں دونوں فرقوں کے بیچ ایک نیا معاہدہ ہوا اور اس معاہدہ میں پل غلام حسین اور پاٹانالہ کے تنگ راستوں سے گزرنے والے شیعہ جلوسوں میں شرکاء کی تعداد محدود کر دی گئی ۔ بہر حال اس طرح جلوس نکلنے سے تناؤ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی رہا دونوں فرقوں کی ضد اور بحث اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ شیعہ حضرات سنّیوں کے جلسوں میں خلفاء کے نام تک لگے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۷۵ء کو چوک منڈی میں میلاد شریف کے لئے بنائے گئے گیٹ پر خلفاء کے نام لکھے دیکھ کر شیعوں میں غصہ پھیل گیا اور مشتعل ہو کر نعرے بازی تک کی نوبت آگئی آخر میں پولیس نے خلفاء کے نام ہٹوا دئے۔ پھر ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء کو سنّیوں نے مدح صحابہ کے جھنڈے اچانک نکالنا شروع کر دئے ان کا کہنا تھا کہ وہ گروہ در گروہ کالے پہاڑوں کے جھنڈے میں شرکت کرنے کے لئے جارہے ہیں۔ اس طرح معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جھنڈے نکلے تو کئی جگہ شیعوں۔ نے جوابی جلوس نکالے اور پتھراؤ کیا۔ پولیس نے ہوائی فائر اور لاٹھی چارج کا سہارا لیا۔ بعد میں امن بحال ہو گیا۔ ۱۹۷۶ء میں بھی بارہ وفات کے موقع پر سنّیوں نے پھر جگہ جگہ سے جلوس نکالے شیعوں نے اپنے محلوں سے تبرّہ کے جوابی جلوس نکالے ۔ کئی جگہوں پر معمولی سا فساد بھی ہوا مگر بعد میں حالات نارمل ہو گئے۔

عزاداری اور مدح صحابہ کا ٹکراؤ

شیعہ قیادت بہت ہوشیاری کے ساتھ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۷۷ء تک مدح صحابہ کے جواب میں تبرہ کا جلوس نکال کر سنّیوں کو شکست دینے میں کامیاب رہی تھی مگر ۱۹۷۷ء کے بعد حالات

بالکل بدل گئے۔

۳ مارچ ۱۹۷۷ء کو بارہ وفات کے موقع پر سنّیوں نے جلوس مدح صحابہ گلی گلی سے نکالے شیعوں کے لیڈر اشرف حسین ایڈوکیٹ نے اس کے جواب میں کئی جگہ سے تبرہ کے جلوس نکلوائے اور شام ہوتے ہوتے کئی جگہوں پر فساد ہو گیا اور دو لوگ ہلاک بھی ہوئے بعد میں پولیس نے حالات کو قابو میں کرنے کے لئے کرفیو لگا دیا اور چند روز کے بعد شہر کی زندگی معمول پر آگئی۔

عام چناؤ

اسی دوران ملک میں عام انتخابات ہو رہے تھے شیعوں کا خیال تھا کہ ایمر جنسی کے کالے قانونوں سے ہاتھ آئی بدنامی کا اثر کم کرنے کے لئے کانگریس نے جان بوجھ کر ۳ مارچ کو مدح صحابہ کے جلوس اٹھوائے مگر فساد ہو جانے کے سبب سنی بھی کانگریس سے خفا ہو گئے شیعہ تو پہلے سے ناراض تھے اس طرح شیعہ اور سنّی سب ہی نے مل کر نئی تشکیل شدہ جنتا پارٹی کو ووٹ دیکر ہیم وتی نندن بہوگنا کو کامیاب بنایا اور شیلا کول کو شکست دی۔ ۱۸ مارچ کو لکھنؤ میں پولنگ بہت خوشگوار ماحول میں انجام پائی۔ ۲۱ مارچ کو جب نتائج آئے تو اندرا گاندھی سنجے گاندھی شیلا کول اور کانگریس کے دوسرے مہار تھی ہار چکے تھے ان شکستوں کیساتھ ہی ایمر جنسی کو بھی شکست فاش نصیب ہوئی۔ جن سنگھ جنتا پارٹی میں ضم ہو چکی تھی۔ ۲۲ مارچ کو اندرا گاندھی نے استعفی دیا۔ ہندوستان کے سیاسی افق پر نیا آفتاب ابھر رہا تھا اور جمہوریت کی دیوی ایک نئے روپ میں سج سنور کر سامنے آرہی تھی تو لکھنؤ اپنے ماضی کے جھگڑوں میں الجھا ہوا تھا۔

نئی حکمت عملی سنّیوں کی جانب سے علموں کے جلوس پر پتھراؤ کرنے کی روایت پرانی ہو چکی تھی اور اس سے ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ ۲۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو ضلع انتظامیہ نے بغیر کسی خاص انتظام کے نوچندی کا جلوس نکلوایا جب یہ جلوس پل غلام حسین کے پاس پہنچا تو سنّیوں نے نئی حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے علم کے پیچھے جھنڈے کا جلوس نکال

دیااس کے بعد فساد پھوٹ پڑا۔ جب ہندوستان کے نئے وزیر آعظم کی حیثیت سے مسٹر مرارجی دیسائی حلف لے رہے تھے لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں دولاشیں پوسٹ مارٹم کے انتظار میں تھیں اور کئی زخمی بستروں پر پڑے تھے کئی غریب اپنے جلے ہوئے گھروں کی راکھ پر بیٹھے اس سیاسی تبدیلی کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔اس فساد کے بعد شیعوں کے جلوسوں پر پابندی لگ گئی اور کئی اردو اخباروں نے صحافت کا بھیانک چہرہ دکھاتے ہوئے شیعوں کے خلاف بھرپور مہم چھیڑ دی۔کانپور کے روزنامہ سیاست جدید نے تو خود کو سنّیوں کا ترجمان بناتے ہوئے نہ صرف تعزیہ داری کے خلاف بھرپور مہم چھیڑ دی بلکہ شیعوں کے دل آزاری کو ہی اپنی صحافت کا معیار بنالیا۔ ویسے بھی اردو صحافت زیادہ تران لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو قلم کا استعمال بولنے کے لئے کم اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے زیادہ کرتے ہیں۔اس بیچ ۲۴اپریل کو ایک شیعہ ڈاکٹر کو حسین آباد میں قتل کردیا گیا۔۲۵راپریل کو بھی ایک شیعہ نوجوان کو زخمی کیا گیا۔

ادھر سپریم کورٹ نے ۲۵اپریل کو اسمبلیاں تحلیل کرنے کا حکم دے دیا اور ۱۲جون ۱۹۷۷ء کو اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اس چناؤ میں شیعہ سنّی منافرت کی جھلک دکھائی نہیں پڑی یہاں تک کہ کانگریس کے امیدوار شکیل احمد کو سنّیوں نے ووٹ نہیں دئے۔ اس کے بعد رمضان کی نوچندی آگئی اور شیعوں کے جلوسوں پر لگی پابندی نہیں اٹھی تو ۱۸اگست ۱۹۷۷ء سے انھوں نے آصفی امام باڑہ سے احتجاجی تحریک شروع کردی۔ مگراس بار سنّیوں کے ساتھ ساتھ ضلع حکام بھی بضد تھے کہ یک طرفہ طور پر جلوسوں کی اجازت نہیں دی جائے گی اوراس بار مدح صحابہ اور عزاداری کو آمنے سامنے رکھ کربات کی جارہی تھی۔ کیونکہ سنّیوں نے مدح صحابہ کو عزاداری سے ٹکرانے میں ۱۹۰۵ء کے بعد پہلی بار کامیابی حاصل کرلی تھی۔ نئی حکومت میں شیعوں کی پرانی دوست جماعت جن سنگھ اپنا چولا بدل کر جنتاپارٹی میں تبدیل ہوچکی تھی شیعہ بے سہارگی اور بیچارگی کے عالم میں خود کو وقت کی چکی میں پستا دیکھ رہے تھے۔ پھر بھی رمضان تک شیعوں کو امید تھی کہ جلوس ضرور اٹھیں گی مگر ۶ ستمبر ۱۹۷۷ء کو ۲۱رمضان کے جلوس حکومت نے اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ اس دن شہر میں کئی جگہہ شیعوں پر حملے بھی ہوئے پل

غلام حسین اور اکبری گیٹ سے گزرنے والے شیعوں پر چاقو سے وار بھی کیئے گئے۔ دولوگ اس جھگڑے میں ہلاک ہوئے۔ ۸ ستمبر کو نئے لکھنؤ کے ماڈل ہاؤس علاقہ میں شیعہ سنّی جھگڑا ہوا اور اسی دن ہسپتال میں ایک شیعہ کی موت ہوئی۔ ۱۰ر ستمبر کو ایک شیعہ کو ہلاک کیا گیا اور ایک عورت زخمی ہوئی۔ اور ۱۱ تاریخ ایک شیعہ نوجوان زخموں کی تاب نہ لا کر ہسپتال میں چل بسا۔ ۱۳ ستمبر کو چوپٹیاں کے قریب ایک شیعہ نوجوان کو چاقو مار کر زخمی کر دیا گیا۔ الوداع کے موقع پر ٹیلہ والی مسجد اور شیعوں کے درمیان شدید تناؤ کے بیچ نماز ادا کی گئی۔ اس بیچ ۱۴ ستمبر کو عیدالفطر پڑی تو شیعوں نے اس دن یوم غم منایا کالے کپڑوں میں نماز پڑھی گھروں میں سوئیاں نہیں پکیں اور عید کی نماز کے بعد ماتم ہوا اور جنتا پارٹی کے خلاف شیعوں نے مظاہرہ کیا۔

۲۲ ستمبر سے شیعوں نے اپنی احتجاجی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا لیکن اسی بیچ نئے وزیر اعظم مسٹر مرارجی دیسائی آگئے ان سے شیعوں کا ایک وفد ملا انھوں نے نہایت دھیان سے شیعوں کی بات سنی شیعوں نے ان کو بتایا کہ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۴ء میں دونوں فرقوں کے بیچ سمجھوتہ ہو چکا ہے مگر سنّی حضرات ضلع حکام کی مدد سے معاہدوں کی خلاف ورزی کر کے جلوس نکالنا چاہتے ہیں۔ مرارجی دیسائی ایک اصول پسند آدمی تھے انھوں نے ضلع انتظامیہ کو حکم دیا کہ ۶۹ء ۱۹۷۴ء کے معاہدوں کے مطابق شیعوں کے جلوس نکلوائے جائیں۔

چونکہ ضلع انتظامیہ کی مرضی نہیں تھی کہ شیعوں کے جلوس اٹھیں اس لئے اس نے ضروری فورس اور حفاظتی انتظامات کئے بغیر ۲۷ ستمبر کو شیعوں کے جلوس اٹھوانے کا اعلان کر دیا۔ ۲۷ ستمبر کو سنّیوں نے شہر میں عام ہڑتال کی شام کو ٹیلہ والی مسجد پر سنّیوں کا جلسہ عام ہوا جس میں تشدد کی دھمکیاں بھی دی گئیں مگر ایک بھی سنّی لیڈر کو احتیاطی اقدام کے طور پر ضلع انتظامیہ نے گرفتار نہیں کیا حالانکہ شیعہ کالج کے ایک طالب علم کو ٹیلے والی مسجد کے جلسے کے باہر ہی بری طرح زخمی کیا جا چکا تھا۔ الغرض ۲۸ ستمبر کو شیعوں کا جلوس کاظمین سے نکل کر پاٹا نالہ تک آیا تو فرنگی محل کے پل کے نزدیک سنّیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ایک اور جلوس تالکٹورہ کی کربلا تک پہنچ گیا لیکن بعد کے چھوٹے چھوٹے جلوسوں پر زبردست پتھراؤ اور فائرنگ ہوئی بعد

میں پولیس نے سنّیوں پر کئی جگہہ فائرنگ کی پہلے ہی دن کی لڑائی میں دس بارہ لوگ ہلاک ہوئے۔
۲۹ ستمبر کو کانپور کے سنّیوں کو بھی مشتعل کر دیا گیا اور انھوں نے کانپور کے شیعوں پر خوب ظلم
ڈھائے وہاں بھی پولیسلیس نے فائرنگ کی کچھ لوگ ہلاک وزخمی ہوئے۔

لکھنؤ میں فساد کے بعد پورے شہر پر سنّی فرقہ کا قبضہ سا ہو گیا تھا کیونکہ صوبے بھر میں سنّی پولیس فائرنگ کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے اور سرکاران کی مزید ناراضگی مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ لکھنؤ میں متاثرہ علاقوں میں امداد پہنچانے کے نام پر سنّی فرقہ کے گروہ شیعوں کو دہشت زدہ کرتے نظر آتے تھے۔اور سرکار خاموش بیٹھی تھی۔ کرفیو کے دوران ہی شیعوں پر حملے کئے جارہے تھے روزانہ راتوں کو نعرے بازی کر کے شہر میں دہشت پھیلائی جارہی تھی۔ قتل و بربریت کا ننگا ناچ ہو رہا تھا اور کوئی شیعوں کی مدد کرنے والا نہ تھا تقریباً پندرہ شیعہ کرفیو کے دوران مختلف علاقوں میں ہلاک کئے جا چکے تھے۔ پھر شیعوں نے جوابی کاروائی کی اور ٦ ستمبر کو وکٹوریہ اسٹریٹ پر دن دہاڑے کچھ شیعہ نوجوانوں نے ایک سنّی مولانا کو گولی ماردی۔اس واقعہ کے بعد اچانک چاقوزنی کا سلسلہ رک گیا اور دس اکتوبر کو کرفیو بھی اٹھ گیا لیکن شیعوں کے جلوسوں پر مستقل طور پر پابندی لگ گئی۔

ضلع حکام کی مرضی یہی تھی کہ شیعوں کے جلوس نہ اٹھیں کیونکہ سال بھر میں کم سے کم ایک سو ستر دنوں میں شیعوں کے تقریباً ایک ہزار جلوس اٹھتے تھے۔ ہر مہینے کی نوچندی جمعرات نوچندی جمعہ اور نوچندی ہفتہ تک کو شیعوں کی طرف سے علم اٹھائے جاتے تھے اس کے علاوہ محرم کے دو مہینے آٹھ دن کے ایام غم کے دوران بھی بیشمار جلوس اٹھتے تھے۔ ضلع حکام کے لئے جلوس بند ہونے کا مطلب تھا کم سے کم پولیس فورس اور پرانے لکھنؤ میں کم سے کم ڈیوٹیاں اور راتوں کی جاگ سے چھٹکارہ اس لئے شیعہ اپنے رویہ میں لاکھ نرمی لاتے جلوس تو اٹھ نہیں سکتے تھے۔

بہر حال ہندوستان میں تعزیہ کے جلوسوں پر یا تو اورنگ زیب نے پابندی لگائی تھی یا پھر لکھنؤ کی ضلع انتظامیہ نے یہ کام انجام دیا۔ کچھ دن کے بعد محرم آگیا سرکار سنّیوں کو ناراض کر کے

شیعوں کے جلوس نکلوانے کے موڈ میں نہیں تھی اور سنّی کسی بھی حالت میں شیعوں کے جلوس نکلنے نہیں دینا چاہتے اب ان کی طرف سے ایک جلوس مدح صحابہ کا نہیں بہتر جلوسوں کا مطالبہ کیا جارہا تھا۔ ظاہر ہے شیعہ قیادت اس پر کیسے راضی ہو سکتی تھی۔ شیعوں کے جن سنگھی دوست رام پرکاش گپتا اب جنتا پارٹی کا لبادہ اوڑھے صوبے کے وزیر داخلہ تھے اب ان کو صرف اپنا ووٹ بینک دکھائی دے رہا تھا انھیں شیعوں کے جمہوری حقوق سے کچھ سروکار نہیں تھا۔ اپنے خلاف چل رہی گہری سازش سے بے خبر شیعہ قیادت نے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مار لی اور رام نریش یادو سے گفتگو میں ناکامی کے بعد یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے کہ جائے ہم مجلسیں بھی نہیں کریں گے ہم محرم ہی نہیں منائیں گے۔ شیعہ قیادت نے شائد یہ سوچا تھا کہ وہ مجلسیں نہیں کریں گے تو سرکار پر اخلاقی دباؤ پڑے گا مگر ہندوستانی سیاستدانوں کی عادت و اطوار سے بے خبر شیعہ قیادت کو کیا معلوم تھا کہ یہ تو ضلع انتظامیہ کے لئے سونے پہ سہاگہ والی مثل کے مترادف ثابت ہو گا۔

ان دنوں مولانا کلب عابد صاحب علی گڑھ میں تھے انھیں جب اس کی خبر موصول ہوئی تو انھوں نے صرف ایک جملہ کہا "ہائے یہ کیا کیا؟" بہر حال شیعوں نے مجلسیں بند کر دیں اور کونسل ہاؤس کے سامنے گونگی بہری سرکار سے فریاد کرنے لگے مگر بات نعرے بازی اور جوشیلی تقریروں سے آگے نہیں بڑھی۔ ۲۲ دسمبر کو عاشور دن کے تقریباً دس ہزار لوگوں نے آصفی امام باڑے سے گرفتاری کے لئے خود کو پیش کر کے اپنا غصہ دکھایا مگر جیلوں میں جگہ نہ ہونے کے سبب سب لوگ تین چار بجے رات تک اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

ایران کے اسلامی انقلاب کا اثر

۱۹۷۸ء میں ایران میں اسلامی انقلاب کی لہریں طوفان کی شکل اختیار کر رہی تھیں اور شاہی تخت و تاج کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جانے والی تھیں شائد اسی انقلاب کا اثر لکھنؤ کے کچھ نوجوانوں کو بھی بیدار کر رہا تھا۔ مگر ان کے پاس قیادت کی کمی تھی انھوں نے دل ہی دل میں امام خمینی جیسی انقلابی شخصیت کو اپنا رہنما مان لیا۔ امام خمینی ان دنوں پیرس میں تشریف فرما تھے لکھنؤ

کے نوجوانوں نے ایران کے انقلاب سے روحانی بیداری لیکر عزاداری کی بحالی کی تحریک شروع کی تو اس وقت لکھنؤ میں شیعہ عالم دین مولانا آغا روحی صاحب خود کو امام خمینی کا نمائندہ اور عزیز دار بتا رہے تھے۔ انھوں نے شیعہ نوجوانوں کی تحریک کی مخالفت شروع کی۔ شیعہ نوجوانوں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور ضلع انتظامیہ کی عائد کی ہوئی پابندی کے خلاف ایک زبردست تحریک شروع کرنے کا پلان بنالیا۔ ان نوجوانوں کے ساتھ ہمارے والد جناب شمس الحسن تاج، چچا شہریار عزمی اور ناظر خیامی بھی شامل تھے۔

یہ تحریک بھی بڑے ڈرامائی انداز میں شروع ہوئی دو دسمبر ۱۹۷۸ء کو محرم کی پہلی تاریخ تھی اداس اور بجھے ہوئے شیعہ نوجوان جوہری محلّہ کی گلی میں بیٹھے شیعہ قیادت کو کوس رہے تھے کہ اچانک ایک رائے ابھری کی اب کی عاشور کے دن جلوس اٹھایا جائے سب نے حامی بھری تو گیرو گھول کر پیلے رنگ سے جوہری محلّہ کی ایک دیوار پر نعرہ لکھا گیا "عزاداری یا موت یوم فیصلہ بروز عاشور بمقام امام باڑہ غفرانماب" اس نعرے کے لکھتے ہی دوسرے دن سے ضلع انتظامیہ میں کھلبلی مچ گئی کس نے لکھا ہے کون کون اس میں شامل ہے لوکل انوسٹی گیشن یونٹ کے ہرکارے دوڑنے لگے پھر پمفلٹ چھپے جس میں جان دینے کا اعادہ کیا گیا تھا۔ مگر سرکار یہ پتہ لگانے میں ناکام رہی تھی کہ آخر اس تحریک کے پیچھے کون لوگ ہیں میں ان دنوں جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں زیر تعلیم تھا میں ۶ر دسمبر کو لکھنؤ پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس تحریک کا گڑھ تو ہمارا گھر ہی ہے مگر ہمارے ماموں مولانا کلب عابد صاحب مرحوم کو اس بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے کہ یہ تحریک کس کی ہے۔ لکھنؤ میں میرے نوجوان ساتھی جنھوں نے یہ تحریک شروع کی تھی بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے کیونکہ ہمارے گروہ میں میرے علاوہ کوئی ایسا نہیں تھا جو جلسہ عام میں تقریر کر سکتا انھیں یقین تھا کہ میری تقریروں سے لوگوں میں جوش پیدا ہو جائے گا۔

۶ر محرم کو شام پانچ بجے بڑے امام باڑے میں اشرف حسین صاحب نے ایک جلسہ بلایا تھا اس میں پہنچ کر میں نے اعلان کیا کہ یہ تحریک ہماری ہے۔ دوسرے دن صبح کو ہمارے والد کو پولیس نے گرفتار کر لیا لیکن میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے والد کی گرفتاری کے بعد

مولانا کلب عابد صاحب کو علم ہوا کہ یہ تحریک ہم لوگ چلا رہے۔ وہ اس دن بہت رنجیدہ تھے اور غصہ میں بھرے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اتنا بڑا قدم اٹھالیا گیا اور ان سے پوچھا تک نہیں گیا؟ سب لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں جان بوجھ کر انجان بن رہا ہوں؟ کسی کی نظر میں میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے؟ میں اس طرح کی حرکتیں برداشت نہیں کر سکتا میں شیعوں کی قیادت چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے لکھنؤ چھوڑ دوں گا" مولانا مرحوم کے غصہ سے ہم سب بہت ڈرے ہوئے تھے اور ہم لوگوں میں، جوہری محلّہ میں آنے کی ہمت تک نہیں تھی۔

آٹھ محرم کی صبح کو پولیس ہمارے چھوٹے بھائی جمیل شمسی کو گرفتار کر کے لے گئی مگر میں پھر بھی پولیس کی گرفت سے باہر رہا۔ اور جلسہ عام میں تقریر کر کے چپکے سے فرار ہو جانے میں کامیاب ہوتا رہا آٹھ محرم کو شام تین چار بجے کے قریب ہم لوگ حضرت گنج میں ٹہل رہے تھے تب ہی ایک شیعہ وکیل سے ملاقات ہوئی کہنے لگے پریس کلب میں علی ظہیر صاحب کی پریس کانفرنس ہے چلو تم لوگ بھی چلو ہم لوگ ان کے ساتھ ہولئے۔ پریس کانفرنس میں علی ظہیر صاحب کو آنے میں دیر ہوئی تو ہم لوگوں نے اخبار والوں سے الگ الگ بات کی اور ان کو صورتحال سے آگاہ کیا اخبار والے پہلی بار تحریک کے کرتا دھرتا لوگوں سے ملے تو بہت خوش ہوئے انھوں نے دوسرے دن کے اخبار میں علی ظہیر صاحب کی خبر کے بجائے ہم لوگوں کا بیان چھاپ دیا بلکہ ایک اخبار نے تو ہم لوگوں کا بیان علی ظہیر صاحب کے نام سے ہی شائع کر دیا جبکہ علی ظہیر صاحب نے پریس کانفرنس اس لئے بلائی تھی کہ وہ ہم لوگوں کے یوم فیصلہ کے نعرے کو واپس لئے جانے کی اپیل کرنا چاہتے تھے۔

نو محرم کو شیعہ دانشوروں کے نام سے ایک جلسہ عام بڑے امام باڑے میں بلایا گیا اس جلسہ میں شیعہ ہر طرف سے امنڈ پڑے اور تقریباً پچاس ہزار کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ اس جلسہ میں علی ظہیر صاحب سمیت بہت سے شیعہ دانشور شریک تھے سب دانشوروں نے ہم لوگوں کی تحریک کی مخالفت کی اور اس کو واپس لینے کے لئے مولانا کلب عابد صاحب سے بھی گزارش کی اور آخری فیصلے کا اختیار بھی ان ہی کو دے دیا۔ مولانا مرحوم نے اپنی تقریر میں پہلے تو ہم لوگوں کی مذمت کی

کہ ہم لوگوں نے بغیر کسی سے مشورہ لئے ہوئے اتنی بڑی تحریک شروع کردی مگر اس تحریک کو ابھارنے میں سرکار کے رول پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ سرکار نے شیعوں کو اتنا دبایا کہ وہ مجبور ہو کر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں مگر سب سے اہم بات مولانا کہی کہ میں نے آج تک نہ تو عزاداری کی کسی تحریک کی مخالفت کی ہے اور نہ کروں گا گو کہ ان بچوں نے میری مرضی کے بغیر اعلان کیا ہے لیکن میری اللہ تعالی سے دعا ہے کہ جو بچے کل علم کا جلوس لے کر نکل رہے ہیں اللہ ان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے" ان کے ان دعائیہ کلمات کے بعد تو شیعہ نوجوان جوش میں جھوم اٹھے اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ تحریک صرف ہماری تحریک نہیں پوری شیعہ قوم کی تحریک ہے۔ دانشوروں کے جلسے کے بعد میں نے تقریر کی اور عاشور کے دن کا پروگرام لوگوں کے سامنے رکھا اور بعد میں مجمع کے بیچ میں گم ہو کر غفرانماب کے امام باڑے پہنچا جہاں مجلس ہوئی اور میں تقریر کر کے پچھلے دروازے سے رفوچکر ہو گیا۔ اس رات رائل کیفے کے باہر ہمارے ایک صحافی دوست نرائن صاحب ملے اور کہنے لگے کہ "آپ لوگ کل صبح اپنے گھروں سے نکل نہیں پائیں گے آپ کو گھروں میں ہی بند کر دیا جائے گا" اس خبر سے بھی ہم لوگوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ ہم لوگوں نے نئی اسکیم بنانا شروع کردی اور بعد میں فیصلہ کیا کہ صبح ہم لوگ پرانے لکھنؤ سے نہیں نئے لکھنؤ کے مقبرہ امجد علی شاہ (ہلواسیہ مارکیٹ کے سامنے) کی مسجد سے علم اٹھا کر شاہ نجف لے جائیں گے۔ رات ہم لوگوں نے نزہتی پر نواب افخر حسین صاحب کے گھر پر گزاری اور صبح کو ہم سب سبطین آباد کی مسجد میں آئے اور وہاں سے جلوس اٹھا مسجد میں ہمارے ساتھ صرف ۲۵ لڑکے تھے مگر ہم لوگ طئے کر چکے تھے کہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش نہیں کرینگے بلکہ پولیس کے لاٹھی ڈنڈے برداشت کریں گے مسجد کے نگراں شرافت حسین نے اپنے گھر سے علم لیا اور ہمارے ساتھ باہر نکل پڑے باہر نکلتے ہی بہت سے شیعہ ادھر ادھر سے دوڑ کر ہمارے جلوس میں شامل ہو گئے اور ہماری تعداد کافی بڑھ گئی مگر نہ تو پولیس نے ہمیں روکا نہ ہم پر لاٹھی چارج ہوا اور ہم سب لوگ ماتم کرتے ہوئے شاہ نجف تک پہنچ گئے۔

ادھر پرانے لکھنؤ میں بھی پولیس کا کڑا پہرا توڑ کر بہت سے شیعہ نوجوان غفرانماب

ادھر خاندان بنی ہاشم کے لوگ اس چناؤ اور الکشن سے بے خبر رسولؐ مقبول کو مدینہ کی خاک میں دفن کر رہے تھے اور رسول کے داماد حضرت علیؑ اور ان کے چند دوسرے قریبی رشتے دار رسول اللہ کے جسد مقدس کو اس زمین کے حوالے کر رہے تھے جو خود مقدس ہونے کا شرف حاصل کر رہی تھی۔

ثقیفہ بنی ساعدہ میں چناؤ کے بعد جب مسلمان واپس محلّہ بنی ہاشم واپس آئے تو رسول اللہ کو دفن کیا جا چکا تھا۔ ان ہی لوگوں کی زبانی خاندان بنی ہاشم کے افراد کو یہ علم ہوا کہ حضرت ابو بکر کو رسول اللہ کی سلطنت کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔

حضرت علی اور ان کے دوست غدیر خم میں رسول کے ذریعہ کئے گئے اعلان کو حرف آخر سمجھتے تھے۔ اور ان کو اس چناؤ پر اعتراض بھی تھا کیونکہ ان کے نزدیک حضرت علی سے زیادہ اس جگہ کا کوئی دوسرا حقدار نہ تھا۔ مگر حضرت علی یا ان کے ساتھیوں نے اس چناؤ کے خلاف کسی قسم کی محاذ آرائی یا تصادم کی نوبت نہیں آنے دی کیوں کہ اس وقت کسی تصادم کا مطلب تھا اسلام کی تباہی و بربادی۔ حالانکہ ابوسفیان نے حضرت علی سے اس چناؤ کے بعد آکر کہا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو مکہ و مدینہ کی گلیوں کو سپاہیوں سے بھر دیا جائیگا اور ان کو خلیفہ وقت بنوا دیا جائے گا۔ مگر حضرت علی نے ابوسفیان کو دوٹوک جواب دیا کہ ''اے ابوسفیان تو کب سے اسلام کا دوست ہو گیا؟'' اگرچہ حضرت ابو بکر کے خلیفہ مقرر ہو جانے کے بعد حضرت علی نے کسی قسم کی مزاحمت اختیار نہیں کی پھر بھی ان سے زبردستی حضرت ابو بکر کی بیعت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی گئی جس سے ان کے اور حضرت ابو بکر کے تعلقات بگڑ گئے۔ اس کے علاوہ باغ فدک کے معاملہ میں رسول کی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ کا حق وراثت تسلیم نہ کرنے کے مسئلہ پر بھی خاندان بنی ہاشم اور حضرت ابو بکر کے درمیان اختلافات رہے اور یہاں تک کہ حضرت فاطمہ تازندگی حضرت ابو بکر کے دربار نہیں گئیں اور خود حضرت علی بھی حضرت فاطمہ کی زندگی میں حضرت ابو بکر سے ملنے نہیں گئے۔

۱۳ راگست ۶۳۴ء میں جب حضرت ابو بکر کا اخری وقت آیا تو انھوں نے حضرت عمر

کے امام باڑے میں رات سے ہی جمع تھے۔ مگر عاشور کی صبح پہلا جلوس ہمارے گھر کی گلی سے برآمد ہوا جس کی قیادت مولانا جواد صاحب کر رہے تھے مولانا کلب عابد صاحب کے چھوٹے بیٹے کلب نقی اور ہمارے چچا شہریار عزمی اور بھائی عقیل شمسی سمیت اس جلوس میں ہمارے گھر کے سب ہی افراد شامل تھے جب موقع پر موجود پولیس والوں نے لاٹھی چارج کیا اور کلب جواد صاحب کے ہاتھوں سے علم چھیننا چاہا تو اور چھت پر کھڑی عورتیں اور بچے بھی ماتم کرتے ہوئے باہر نکل آئے پھر غفرانمآب کے امام باڑے کا جلوس بھی سڑک پر آگیا اور چند ہی لمحوں میں شہر کے ہر کونے سے علم اٹھ کر وکٹوریہ اسٹریٹ پر پہنچ گئے۔ ہمارے نعرے پر سارے شیعہ گھروں سے باہر آچکے تھے صرف وہی گھروں میں بیٹھے تھے جو عزاداری کی تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ ضلع انتظامیہ بے بس تھی ہزاروں شیعہ سڑک پر موجود تھے صورتحال پر قابو پانے میں آنسو گیس اور لاٹھی چارج ناکام ہوا تو ضلع حکام نے مولانا کلب عابد صاحب سے مدد مانگی مولانا نے شیعوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اعلان کیا تھا کہ آپ جلوس نکالیں گے سو آپ اس میں کامیاب رہے اب آپ اپنے اپنے گھروں کو جائیں مگر پھر بھی ہزاروں کی تعداد میں جوشیلے شیعوں نے جیل جانے کو ترجیح دی۔ اور تقریباً تین ہزار شیعوں کو اناؤ سیتاپور اور لکھنؤ کی جیل میں چودہ دن کی قید ہوئی۔

اناؤ جیل میں کئی دانشمند اور بافہم شیعہ نوجوانوں نے آپسی ملاقاتوں اور میٹنگوں کے بعد طے کیا کہ جیل سے باہر نکل کر ایک تنظیم بنائی جائے جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہو جو سیاست میں جانے کے متمنی نہ ہوں۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد ۲۶ دسمبر ۱۹۷۸ء میں شیعہ نوجوانوں کی ایک مختصر سی میٹنگ ہوئی جس میں علی کانگریس کے نام سے ایک نئی تنظیم کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ اس تنظیم میں مختلف عہدوں پر ہمارے خاندان ہی کے افراد فائز تھے کیونکہ ہمارے ساتھی چاہتے تھے کہ وہ خود سامنے نہ آئیں اور چند مخصوص چہرے ہی سامنے رہیں۔ مولانا کلب عابد صاحب بھی یوم فیصلہ کی کامیابی کے بعد ہم لوگوں کے سرپرست بن گئے تھے علی کانگریس نے کلب جواد صاحب کو صدر کلب نقی اور علی افخر کو نائب صدر مجھے جنرل سکریٹری اور میرے چھوٹے بھائی

جمیل کو نشر و اشاعت سکریٹری چنا ہمارے مخالفین کا کہنا تھا کہ علی کانگریس صرف ایک خاندان کی جماعت ہے لیکن ہم لوگ اس لئے سامنے تھے کہ اگر کوئی عہدیدار گرفتار ہوں تو ہم لوگ ہی پکڑے جائیں اور ہمارے ساتھی بچ کر کام کرتے رہیں اس کے علاوہ ہم لوگوں کو مختلف عہدوں پر رکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہم لوگوں کا سیاست میں جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا باہری آدمی کے سیاسی فائدے اٹھانے کے خوف نے ہم لوگوں کو مجبور کیا کہ صرف اپنے عزیز اور رشتے دار ہی علی کانگریس کے عہدوں پر رہیں کیونکہ یہ تنظیم کوئی پیسہ بانٹنے یا پیسہ کھانے کے لئے تو بنی نہیں تھی اس کے کسی عہدے پر بیٹھنے کا مطلب تھا اپنے لئے پولیس سے دشمنی لینا۔ خدا کا شکر ہے کہ علی کانگریس والے نہ تو کسی سے مرعوب ہوئے نہ کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ علی کانگریس کا نام جوڑا جا سکا۔

۲۰ جنوری ۱۹۷۹ء کو چہلم کے موقع پر شیعوں نے کرفیو توڑ کر پھر جلوس نکالا۔ اس وقت تک علی کانگریس شیعوں کی آواز بن چکی تھی لیکن بہت سے علماء ہماری مخالفت کر رہے تھے کیونکہ ان کو لگ رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے شیعوں کی قیادت چھینی جا رہی ہے جبکہ ہم لوگ نہ تو شیعوں کی قیادت کرنا چاہتے تھے نہ نیتا گیری کا کوئی شوق ہم لوگوں کو تھا ہم سب بس چاہتے تھے کہ جلوسہائے عزا جلد از جلد اٹھ جائیں۔

۱۵ اگست ۱۹۷۹ء کو ۲۱ رمضان کے موقع پر ہم لوگوں نے رستم نگر کی شبیہہ نجف سے ایک احتجاجی جلوس نکال کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کیا جب ہم لوگ گرفتار ہو کر جیل چلے گئے تو اسی علاقہ میں شیعہ سنّی فرقوں کے بیچ فساد ہو گیا کیونکہ کچھ لوگوں نے گرفتار ہو جانے والے لوگوں پر پتھر پھینکے تھے۔ جمعۃ الوداع کے موقع پر ۱۷ اگست کو ایک بار پھر شیعہ سنّی فرقوں کے مابین تصادم ہوا جس میں ایک شخص کی جان گئی۔ ضلع انتظامیہ شیعوں سے ان دنوں بہت ناراض تھا خاص طور سے علی کانگریس کی تحریک اس کے لئے سر درد بن چکی تھی اس لئے انھوں نے ہمارے حمایتیوں کی گرفتاری کی بھرپور مہم چھیڑ دی میرے والد میرے چچا اور میرے محلّہ کہ تقریباً سب ہی مردوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اس بیچ مرارجی کی سرکار نے اپنا بستر باندھ لیا تھا اور

۲۲ اگست کو چودھری چرن سنگھ کی حمایت سے ہاتھ کھینچ کر کانگریس نے ان کو بھی بے دخل کروا دیا لوک سبھا تحلیل کیئے جانے کی خبر ہم لوگوں کو جیل میں ہی ملی اور ہم لوگوں نے وہیں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بار ہم لوگ کسی کو ووٹ نہیں دینگے۔

۲۵ راگست کو عید کے دن ہم لوگ رہا ہوئے لیکن رہائی پر خوش نہیں تھی کیونکہ ابھی تک جلوس عزا کا معاملہ حل نہیں ہوا تھا لیکن جیل سے نکلنے کے بعد ہم لوگوں نے الکشن بائکاٹ کے بارے میں صلاح مشورہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

مجلسیں پھر سے شروع

تین مہینوں بعد محرم آیا تو علی کانگریس نے سالانہ مجالس کو پھر سے شروع کروانے کی تحریک شروع کی جو شیعہ لیڈر شپ کے غلط فیصلے کی وجہ سے دو سال تک بند رہیں۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ کئی شیعہ ذاکر اس کی مخالفت کر رہے تھے اور کئی لوگ مجلسیں پڑھنے پر راضی نہیں تھے۔ صرف مولانا کلب عابد صاحب مرحوم اور مولانا علی شبر صاحب مرحوم جنہیں ہم لوگوں نے آیت اللہ کا خطاب دیا تھا مجلسیں پڑھنے پر راضی تھے۔ غفرانمآب میں مجلسیں شروع ہوئیں اور حسینیۂ ناظم صاحب میں علی شبر صاحب مجلسیں پڑھنے لگے دو تاریخ سے مولانا آغا روحی صاحب نے بھی مجلسیں پڑھنا شروع کر دیں اور ناظم صاحب کے امام باڑے کے بجائے شیعہ کالج میں مجلسیں پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چار تاریخ سے مولانا حمید الحسن صاحب بھی ناظمیہ مدرسے کی قدیم مجلسیں پڑھنے لگے اور ہم لوگوں کے زبردست دباؤ کے بعد بڑے امام باڑے میں آگ پر ماتم منعقد کرنے کے سلسلے میں انجمن سوگواران کے ساتھ حسین آباد ٹرسٹ کے ذمہ داران تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس طرح محرم کی آدھی شان اپنے آپ ہی واپس لوٹ آئی جو ہم لوگوں کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ دس محرم کے موقع پر احتجاجی گرفتاریوں کے علاوہ کوئی بڑا پروگرام ہم لوگ کرنے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ ملک میں چناؤ ہونے والے تھے کچھ ہی عرصہ کے بعد چناؤ سر پر آ گیا اور ہم لوگوں نے پہلے سے اعلان کے بموجب چناؤ

کے بائکاٹ کا نعرہ دیا۔ جمہوریت کے نام پر اقلیت در اقلیت کا گلا کاٹنے کی سیاسی روش اور اکثریت کی منھ بھرائی کر کے ووٹ مانگنے کی گندی سیاست کو جواب میں الکشن بائکاٹ سے بہتر کوئی نعرہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے شیعوں نے بھی دل کھول کر ہم لوگوں کا ساتھ دیا اور کچھ سیاسی کارکنوں اور کانگریس سے جڑے کچھ علماء کی شدید مخالفت کے باوجود پوری قوم ہم لوگوں کے ساتھ تھی کیونکہ مولانا کلب عابد صاحب بھی محرم کی مجلس میں الکشن کے بائکاٹ کئے جانے کے اعلان کی حمایت کر چکے تھے۔

پہلے تو سیاسی پارٹیوں نے ہمارے نعرے کو پھیکا سمجھا مگر بعد میں شیعہ محلوں میں چناوی مہم کو پھیکا دیکھ کر ان کو معاملہ کی نزاکت کا احساس ہوا۔ خاص طور پر کانگریسی بوکھلا گئے تھے کیونکہ ان کے لئے لکھنؤ کی سیٹ جیتنا کافی اہمیت کا حامل تھا۔ کچھ شیعہ ادارے ہمارے بائکاٹ کے نعرے کو بے اثر کرنے کی غرضی سے باقاعدہ الکشن مہم میں حصہ لینے لگے تھے یہاں تک کے شیعہ حسینی فنڈ والوں نے تو افضل محل میں کانگریس کا ایک کیمپ دفتر بھی کھول دیا تھا مگر عوام ہمارے ساتھ تھے سیاسی پارٹیوں کو اس بات کا پورا اندازہ تھا؟۔ اس لئے ان کے نمائندے ہم لوگوں سے ہی رابطہ قائم کرتے رہے ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو کانگریس کی امیدوار شیلا کول خود علی کانگریس کے دفتر میں آئیں اور ہم لوگوں سے کہا کہ وہ ہمارے مطالبات پر الکشن جیت جانے کے بعد سنجیدگی سے غور کریں گی لیکن ہم لوگ ایک واضح اور صاف اعلان کے بغیر بائکاٹ کا نعرہ واپس لینے پر تیار نہیں تھے شیلا کول نے ہم لوگوں سے کوئی وعدہ نہیں کیا اور کہا کہ وہ تو بس امیدوار ہیں وہ تو فیصلہ کر نہیں سکتی ابھی جلوسوں کے بارے میں فیصلہ تو ہائی کمان کی طرف سے ہی ہوگا الغرض یہ بات چیت ناکام ہو گئی۔

پھر شیلا کول نے ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو ہمارے ایک وفد کی مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کروائی لیکن ضلع انتظامیہ نے اندرا گاندھی کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ جلوسوں سے امن عامہ کو خطرہ لاحق ہے اس لئے اندرا گاندھی نے ہم لوگوں سے یہی کہا کہ جلوس اٹھنے سے فساد ہوتا اس لئے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے جب ہم لوگوں نے ان سے کہا کہ بنارس میں درگا

پوجا کے جلوس پر پتھراؤ ہوا تو جلوس بند نہیں کردیا گیا؟ اور ہندوستان بھر میں جلوسوں پر جھگڑے ہوتے ہیں تو کیا ہندوستان بھر میں ایسے ہی پابندی لگ سکتی ہے ظاہر مے ان کے پاس جواب نہ تھا مسز اندرا گاندھی سے ہم لوگ مل کر لوٹے تو بہت اداس تھے مگر بائکاٹ کا نعرہ واپس نہ لینے کا ارادہ اور زیادہ مستحکم ہو چکا تھا۔ جمہوریت کی ایک خامی یہ ہے کہ اگر ۵۱ آدمی جھوٹ بولیں تو وہی سچ ہے اور اگر ۴۹ آدمی سچ بولیں تو وہ جھوٹ ہے۔ مگر اس نقص کو ختم کرنے کے لئے ہمارے ملک میں آئین کی تشکیل کی گئی تھی تاکہ اقلیتوں کو محض اقلیت ہونے کے جرم میں اپنے حققوق سے محروم نہ کردیا جائے مگر آئین شیعوں کے معاملے میں صرف کتابوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اکثریتی فرقہ کے ووٹوں کے لئے اقلیت سے ہر پارٹی منھ موڑ رہی تھی۔

دوسری طرف کچھ شیعہ علماء کانگریس کے لئے کھل کر کام کر رہے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جن سنگھ کی حمایت کرنے والے مولانا آغا روحی صاحب کانگریس آئی کے لئے بھرپور انداز میں مہم چلا رہے تھے (۱۹۹۸ء کے وسط مدتی چناؤ سے قبل ایک بار پھر آغا روحی صاحب بی جے پی میں شامل ہو گئے ہیں) مولانا حمید الحسن صاحب بھی چاہتے تھے کہ ہم لوگ الکشن بائکاٹ کا نعرہ واپس لے لیں مگر مولانا کلب عابد صاحب کے احترام میں کھل کر بائکاٹ کی مخالفت بھی نہیں کر رہے تھے ان کے گھر پر رانی بخشی شیلا کول اور کانگریس کے لاتعداد لیڈر تقریباً روز آتے اور خود مولانا ہم لوگوں کو بلا کر بتاتے تھے کہ قوم کے مفاد میں کیا ہے اور کس بات سے قوم کو سیاسی طور پر نقصان پہنچ سکتا ہے مگر ہم لوگ ٹس سے مس نہیں ہوئے کیونکہ ہم کو معلوم تھا کہ نقصان جو ہونا تھا وہ تو پہلے ہی ہو چکا ہے اب تو کچھ فائدہ ہی ہو گا۔ کچھ نہ بھی ہو گا تو کم از کم ہندوستان کے طول و عرض میں اخباروں میں الکشن بائکاٹ کی خبریں تو چھپ ہی رہی تھیں تو ہماری بات ہندوستان کے دوسرے باشندوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ یہ تو ہم لوگ بھی جانتے تھے کہ الکشن بائکاٹ سے ملک کا جمہوری نظام درہم برہم نہیں ہو جائے گا لیکن اپنے غصہ کے اظہار کا اس سے بہتر طریقہ شیعہ قوم کے پاس تھا ہی نہیں۔

کچھ دنوں بعد مولانا حمید الحسن صاحب نے ہم لوگوں سے کہا سنجئے گاندھی چاہتے ہیں کہ

شیعہ وفد ان سے ملے اور وہ اس بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں علی کانگریس کا ایک وفد سید کلب نقی کی قیادت میں مولانا حمید الحسن صاحب کے ساتھ امیٹھی کے لئے روانہ ہوا اس کے دوسرے ہی دن لکھنؤ میں پولنگ ہونے والی تھی۔ سنجئے گاندھی نے ایک اقلیت در اقلیت کے درد کو پہلی بار سمجھنے کی کوشش کی اور نہایت انکساری اور اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم لوگوں سے وعدہ کیا کہ اگر ہماری حکومت آگئی تو ہم لوگ شیعوں کے جلوس ضرور اٹھوا دینگے۔ ہم لوگوں نے ان سے کہا کہ عوام شائد ہماری بات پر یقین نہ کریں اور کہیں کہ ہم لوگوں نے پیسہ لیکر بائکاٹ کا نعرہ واپس لے لیا ہے اس لئے اگر وہ تحریری طور پر کوئی بیان ہمیں دے دیں تو بہتر ہوگا۔ سنجئے گاندھی نے کچھ پس و پیش کے بعد ایک خط لکھ کر بھی دے دیا کہ ہم شیعوں کے جلوس ضرور اٹھوا دیں گے۔ مولانا حمید الحسن صاحب ہم لوگوں کے بیچ ثالث کا رول کر رہے تھے اس لئے وہ خط سنجئے گاندھی نے ان ہی کے ہاتھ میں دے دیا۔ لوٹ کر ہم لوگ خوشی خوشی لکھنؤ آئے اور مولانا کلب عابد صاحب کو وہ خط دکھایا۔ حمید الحسن صاحب نے کہا کہ "بھائی صاحب یہ خط میرے پاس ہی رہے تو بہتر ہے" اس پر مولانا کلب عابد صاحب مرحوم نے کہا کہ "ہاں ہاں شوق سے"۔ شام کو مولانا کلب عابد صاحب مرحوم نے الکشن بائی کاٹ کا نعرہ واپس لے لیا اور کہا کہ شیعہ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق ووٹ دیں ہم لوگ بھی شیعوں کے محلوں میں جا کر لوگوں کو حالات سے آگاہ کر کے ان کو ووٹ دینے کی تلقین کرتے رہے الغرض شیلا کول ۲۶ ہزار ووٹوں سے جیت بھی گئیں اور سنّی لیڈر محمود بٹ ہار گئے جو جنتا پارٹی کے امیدوار تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد نو اسمبلیاں بھی توڑ دی گئیں اور یوپی میں بھی نئے انتخابات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہم لوگ بھی نئی صوبائی کی سرکار کے آنے کے انتظار میں خاموش بیٹھ گئے کیونکہ اتر پردیش میں کانگریس سرکار کے آئے بغیر سنجئے گاندھی کا وعدہ پورا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

سنجے گاندھی کا انتقال

۲۳ جون ۱۹۸۰ء کو ایک ہوائی حادثہ میں سنجئے گاندھی کا انتقال ہو گیا اور شیعوں کی تمام

امیدوں پر پانی بھی پھر گیا کیونکہ سنجئے گاندھی نے جس لہجے میں بات کی تھی اس سے لگتا تھا کہ وہ ضرور معاملہ کو حل کر دینگے۔ ہم لوگ صوبے میں نئی سرکار کے آنے تک صبر کرنا چاہتے تھے اس لئے ۲۱ر مضان پر علامتی گرفتاریوں کے علاوہ کوئی بڑا پروگرام نہیں ہوا مگر الوداع کے موقع پر شیعوں اور سنّیوں کے مابین کئی جگہ پر جھگڑا ہوا۔ اسی تناؤ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سنّی نوجوان نے ایک کمسن شیعہ فوٹوگرافر پرویز آغا کو چاقو مار کر شدید طور پر زخمی کر دیا۔ پرویز آغا زخمی حالت میں بچاؤ کے لئے علی کانگریس کے آفس میں داخل ہوا تو ہم لوگ فوراً اس کو اسپتال لے گئے مگر وہاں پہنچنے کے کچھ ہی لمحوں بعد پرویز نے دم توڑ دیا۔ قاتل کو پرویز آغا سے ذاتی رنجش تھی کیونکہ پرویز نے ایک لڑکی کو چھیڑنے سے قاتل کو منع کیا تھا اسی کا بدلہ لینے کے لئے قاتل نے شیعہ سنی فساد کا فائدہ اٹھایا کیونکہ اس طرح کے فسادات میں عام طور قاتل چھوٹ جاتے ہیں اور ان کو پیروی کے اخراجات برداشت کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ کیونکہ مختلف تنظیمیں ان کی پیروی شیعہ سنی کے نام پر کر کے سارے اخراجات خود اٹھائی ہیں۔

علم فاتح فرات

رمضان کے تین مہینے بعد محرم آگیا تب تک اتر پردیش میں نئی صوبائی حکومت آچکی تھی ہم لوگوں کو یقین تھا کہ اس بار ضرور کوئی نتیجہ نکل آئے گا۔ مگر حکومت سے چل رہی گفت و شنید کا کوئی حل نہیں نکل رہا تھا۔ وقت گزرتا جارہا تھا اور ہم لوگوں کے صبر کا باندھ بھی ٹوٹتا جا رہا تھا۔ اس بیچ ضلع انتظامیہ نے ہم لوگوں کو اشارہ دیا کہ دریا والی مسجد سے اٹھنے والا علم فاتح فرات وہ لوگ شائد اٹھوادیں۔ ہم لوگوں نے اعلان کر دیا کہ آٹھ محرم یعنی ۱۹ نومبر ۱۹۸۰ء کو بدھا پارک کے قریب واقع دریا والی مسجد سے سالانہ جلوس اٹھ کر غفرانمآب کے امام باڑے جائے گا چونکہ ہم کو ضلع انتظامیہ کی بات کا یقین نہیں اس لئے ہم لوگوں نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ علم اٹھے گا ضرور چاہے آندھی آئے یا طوفان چاہے لاٹھی چارج ہو یا گولی چلے ہم لوگ جلوس اٹھا کر غفرانمآب کے امام باڑے تک ضرور لائیں گے۔ ہم لوگوں نے عورتوں اور بچوں سے بھی کہا کہ

وہ جلوس میں نہ آئیں۔اس اعلان کے بعد تقریباً ۳۰ ہزار شیعہ دریاوالی مسجد پر اکھٹے ہو گئے۔ ضلع
انتظامیہ کی طرف سے لگاتار پیغامات موصول ہو رہے تھے کہ کیبنٹ کی مٹینگ چل رہی ہے اور
جلد ہی فیصلہ ہو جائے گا لیکن پولیس کا بندوبست دیکھ کر لگتا تھا کہ محض ہم لوگوں کو بہلایا جا رہا ہے۔
ہم لوگوں نے پولیس کے گھیرے کے باہر تقریباً پچاس لڑکوں کو ایک ایک کر کے ریلوے پل کے
نیچے بھیج دیا۔ساتھ ہی ساتھ ہم سب مجمع میں گھوم گھوم کر یہ کہتے رہے کہ جلوس کو غفرانمآب
کے امام باڑے تک کسی بھی حالت میں پہنچانا ہے آج روایتی راستے کی شرط نہیں ہے۔

نو بجے جلوس کا اعلان تھا تقریباً آٹھ بجے چوک کو توالی کے سرکل آفسر نے ہمارے
چھوٹے بھائی جمیل شمسی کو بلا کر سرکار کی طرف سے جاری ایک سرکلر دیا جس میں تحریر تھا کہ
یوپی کی نئی سرکار ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۴ء کے معاہدوں کو تسلیم کرتی ہے لیکن جلوسوں کے بارے میں
کوئی فیصلہ کرنا فی الحال ممکن نہیں ہے۔اس سرکلر کو ہم لوگوں نے مولانا کلب عابد صاحب کو دکھایا
توانھوں نے کہا"اب جو اشرف حسین ایڈوکیٹ کہیں وہی کرو۔اشرف صاحب مرحوم کا کہنا تھا
کہ "پہلے تو ہم جلوس نکالنے کی کوشش کرینگے اور اگر ہم کو پولیس آگے بڑھنے نہیں دے گی تو ہم
اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں گے اور دھرنا دیں گے"۔اشرف حسین صاحب کا نظریہ ہم لوگوں کو پسند
نہیں آیا۔ہم لوگوں نے اپنے کارکنان سے کہا کہ ان کو دھرنے کی بات کہنے دو ہم لوگ پولیس کا
گھیرا توڑیں گے اور علم کو تو مسجد سے باہر نہیں نکالیں گے مگر انجمن کا بینر استعمال کریں گے
پولیس کے گھیرے کے پار کھڑے لڑکوں کو مجلس ختم ہوتے ہی ہم لوگ بینر تھمادینگے پھر ہم
لوگ بھی آگے دوڑ پڑیں گے۔اس جلوس میں مشعلیں بھی ہوتی تھیں۔ مجلس کو مولانا کلب
عابد صاحب نے خطاب کیا مجلس ختم ہوتے ہی ماتم شروع ہوا اور ایک کارکن نے جلتی ہوئی مشعل
پولیس کے اس رسے میں لگائی جو اس نے راستہ روکنے کے لئے لگایا تھا رسہ جلنے لگا تو پولیس والوں
نے اس کو چھوڑ دیا وہ ذرا سا پیچھے ہٹے تو ان کے پشت پر کھڑا نوجوانوں کا جتھہ مسجد کی طرف دوڑا
پولیس والے گھبرا گئے اور کنارے ہو گئے ہم لوگوں نے بینر کو ان نوجوانوں کے حوالے کر دیا جو اس
کے منتظر تھے ہراول دستہ بینر لیکر تیر کی طرح آگے نکل گیا اس کے بعد پولیس والوں نے ہم

لوگوں کی جم کر دھنائی کی وحشیوں کی طرح لاٹھیاں برسائیں اور بندوق کے کندوں سے ہم لوگوں کو مارا لیکن ہم تو صدیوں سے یہ ظلم سہتے آئے تھے ہم پر کیا اثر ہوتا؟ ہم تو اسی میں خوش تھے کہ حضرت عباس باوفا سے تھوڑی سی وفا ہم لوگ بھی کرنے میں کامیاب رہے۔

بہر حال مجھے زخمی حالت میں جاوید مرتضیٰ ایڈوکیٹ اور کئی دوسرے شیعہ اٹھا کر لے جانا چاہتے تھے کہ اسی بیچ اے ڈی ایم سٹی نے مجھے ایک پولیس موبائل وین میں ڈلوادیا مجھے جب ہوش آیا تو رات کے دو یا تین بجے تھے ایک پولیس والے نے مجھ سے میرا نام وپتہ وغیرہ پوچھا اور کہا کہ آپ ہسپتال جانا پسند کریں گے یا تھانے؟ میں نے پوچھا کہ اتنی دیر سے میں گاڑی میں ہی کیوں ہوں تو اس نے کہا کہ آگے بلوائی کھڑے ہیں اس لئے ہم یہیں ٹھرے ہیں۔ خیر کچھ دیر بعد مجھے چوک تھانے پہنچادیا گیا جب کہ میرے اعزاء واقربا سارے ہسپتالوں کے چکر لگا کر تھک چکے تھے۔ رات میں چار بجے کے قریب ہم لوگ لکھنؤ جیل پہنچادیئے گئے۔ جیل کے اسپتال میں ہی میری مرہم پٹی ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھی الگ الگ راستوں سے امام باڑہ غفرانماب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے گو کہ سینکڑوں زخمی بھی ہوئے اور کئی نازک حالت میں اسپتال میں بھی تھے جن میں سے ہمارے ایک ساتھی حضور جانی بعد میں جام شہادت بھی نوش کر گئے۔

دوسرے دن نو محرم کو سخت ترین کرفیو کو توڑ کر ناظم صاحب کے امام باڑے سے حوصلہ مند شیعہ پھر باہر نکل آئے گو کہ پولیس نے ان کو بہت مارا مگر وہ لوگ اپنے حقوق کی بحالی کے مطالبہ کے لئے یہ ظلم بھی سہہ گئے اور گرفتار ہو کر ہمارے ساتھ جیل میں آگئے۔ عاشور کے دن پھر شیعوں نے کرفیو کی دھجیاں اڑادیں اور سڑک پر نکل کر ماتم کیا۔ کئی ہزار گرفتار ہوئے اور بعد میں رہا ہو گئے۔ گیارہ محرم کو ہم لوگ بھی رہا کر دیئے گئے۔

خاموش جلوس کی اجازت

علی کانگریس کی زبردست کامیابی

ہم لوگوں نے صوبے کے مختلف کانگریسی رہنماؤں پر دباوُڈالناشروع کیا کہ وہ ہم کو سنجئے گاندھی کے وعدہ کے مطابق ہمارے حقوق دلوانے مین مدد کریں مگر ہمیں کامیابی نہیں ملی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مولانا حمید الحسن صاحب کے پاس سنجئے گاندھی کا جو خط تھاوہ اس کی تشہیر نہیں چاہتے تھے اس لئے کہہ رہے تھے کہ خط کہیں کھو گیاجب کہ علی کانگریس والوں کو یقین تھا کہ وہ جان بوجھ کر خط کو چھپا رہے ہیں۔ بہر حال خط ہونے یا نہ ہونے سے ہمیں کیا فرق پڑتا تھا؟ ہم لوگ تو اپنے جائز حقوق کی بحالی چاہتے تھے۔

۱۴ دسمبر کو سنجئے گاندھی کا یوم پیدائش تھا اور صدر جمہوریہ میڈیکل کالج میں ایک ادارے کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے آنے والے تھے ہم لوگوں نے سنجئے گاندھی کا وعدہ حکومت کو یاد دلوانے کے لئے اسی دن ایک خاموش جلوس کی اجازت دئے جانے کا مطالبہ ضلع حکام کے سامنے رکھا ضلع انتظامیہ نے کہا کہ وہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو اجازت دے سکتے ہیں کیونکہ چودہ کو راشٹر پتی کے پروگرام کی وجہ سے اس طرح کا جلوس اٹھوانا ممکن نہیں ہے مگر ہم لوگ ضلع انتظامیہ کے جھوٹے وعدوں سے تنگ آچکے تھے اس لئے کے ہم لوگوں نے کہا کہ چودہ دسمبر نہ سہی تو تیرہ دسمبر کو ہم لوگ جلوس اٹھانے پر راضی ہیں اس پر ضلع حکام نے دریافت کیا کہ اگر اجازت نہیں ملی تو آپ لوگ کیا کرینگے؟ ہم لوگوں نے کہا کہ اموسی ایئر پورٹ سے میڈیکل کالج تک کے راستے میں کہیں بھی راشٹر پتی کے کاروں کے قافلے کے آگے لیٹ جائیں گے تاکہ ان کا دھیان اس طرف مبذول کرواسکیں۔

ضلع انتظامیہ نے مجبور ہو کر ہم لوگوں کو ۱۳ دسمبر کو حضرت محل پارک کے سامنے مقبرہ سعادت علی خاں سے جی پی او تک ایک خاموش جلوس اٹھانے کی اجازت دے دی۔ تقریباً پچاس ہزار شیعہ اس جلوس میں شامل ہونے کے لئے وہاں جمع ہوگئے۔ مگر جلوس کی قیادت کے

خطاب کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا۔ دوسری بار بھی حضرت علی نے اپنی حق تلفی کی تلخی کو نہایت صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ حضرت عمر حضرت علی کو اپنا مشیر خاص سمجھتے تھے۔ اور ان سے وقتاً فوقتاً مشورہ لیا کرتے تھے۔

۲۶ نومبر ۶۴۴ء میں حضرت عمر خطاب پر جب ایک مجوسی غلام ابولولو فیروز نے جان لیوا حملہ کیا تو انھوں نے اپنے جانشین کے چناؤ کے لئے ایک چھ رکنی کمیٹی بنا دی۔ اس کمیٹی میں شامل عبدالرحمن بن عوف کو ویٹو پاور حاصل تھی اور کمیٹی کے سامنے حضرت علی اور حضرت عثمان کا نام خلافت کے لئے زیر غور تھا۔ اتفاق سے دونوں حضرات کو تین تین لوگوں کی حمایت حاصل تھی ایسے میں عبدالرحمن بن عوف کی ویٹو پاور کام آئی اور ان کی رائے کے مطابق حضرت عثمان کو تیسرا خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔

۶۵۴ء میں حضرت عثمان کی خلافت اور ان کے طرز حکومت کے خلاف مسلح بغاوت ہو گئی اور اسلامی سلطنت کے کونے کونے سے آئے ہوئے نا مطمئن افراد کے ایک گروہ نے ۱۷ جون ۶۵۴ء کو حضرت عثمان کا قتل کر دیا۔ حضرت عثمان کے قتل کے بعد سارا ملک افرا تفری اور بے چینی کا شکار تھا۔ نہ تو کوئی حکومت تھی نہ انتظامیہ۔ خود ان کے ساتھی مصلحتاً خاموش تھے اور ایسے لوگ بھی چپ تھے جو حضرت عثمان کی مہربانیوں سے ہی اعلیٰ عہدوں پر پہنچے تھے خاموشی سے ان کو قتل ہوتا ہوا دیکھتے رہے۔ سوائے حضرت علی کے جنھوں نے باغیوں کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی اور مصالحت کی بھرپور کوشش کی یہاں تک کہ حضرت حسن اور حضرت حسین کو محصور شدہ حضرت عثمان کے لئے کھانا اور پانی لے کر برابر بھیجتے رہے۔ لیکن باغیوں نے حضرت عثمان کے گھر کی دیوار پھاند کر ان کو قتل کر دیا اور ان کی اہلیہ بھی زخمی ہو گئیں۔

حضرت عثمان کے قتل کے بعد اسلامی سلطنت کسمپرسی کا شکار تھی۔ اور ملک کی قیادت کی ذمہ داری اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ اس عالم میں ہزاروں مسلمان مرد عورتیں اور بچے اپنے گھروں سے نکل آئے اور حضرت علی کے گھر کے آگے جمع ہو گئے۔ سب ہی حضرت علی سے التجا کر رہے تھے کہ وہ اس مصیبت کی گھڑی میں اسلامی سلطنت کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔

لئے علماء نہیں تھے کیونکہ مولانا کلب جواد صاحب علی گڑھ میں تھے۔ اور دوسرے علماء اس جلوس کے حق میں نہیں تھے ایسے میں کٹرہ ابوتراب سے مولانا تقی میاں مولانا سید علی صاحب مولانا جعفر صاحب کو جلوس میں لانے کے لئے مولانا کلب جواد صاحب کار سے ان کے گھروں کی طرف چل دیۓ اسی بیچ پرانے لکھنؤ کے اکبری گیٹ اور پاٹانالہ علاقوں میں سنیوں کے ایک طبقہ نے خاموش جلوس کی اجازت دیۓ جانے کے خلاف فساد کر دیا۔ مولانا کلب جواد پر بھی حملہ ہوا ان کی گاڑی توڑ دی گئی مگر خود جواد صاحب محفوظ رہے کیونکہ وہ اندر گلی میں جا چکے تھے۔ ادھر جلوس میں تاخیر ہو رہی تھی۔ آخر کار جلوس کی قیادت کے لئے مولانا رضوان حسین اور مولانا سید قمی صاحب آگئے اور ان کی قیادت میں جلوس تقریباً چار گھنٹے میں جی پی او پارک پر ختم ہوا۔ خاموش جلوس پر ہنگامہ سے ایک بات تو واضح ہو گئی کہ سنّیوں کا ایک طبقہ محض عداوت میں شیعوں کے جلوس نکلنے نہیں دیتا اور تبرہ بازی کا بے بنیاد الزام لگا کر ان کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگلے ہفتہ مولانا کلب عابد صاحب، سید سبط رضی بریگیڈیر انور حسین رضوی کے ساتھ میں بھی اندرا گاندھی سے ملنے کے لئے ان کے گھر صفدر جنگ روڈ پہنچا وہاں یوپی کے وزیر اعلیٰ وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بہت اچھے انداز میں شیعوں کی طرفداری کی اور اندرا گاندھی کے سامنے کہا کہ لوگوں کو تنگ جگہوں سے جلوس گزارنے پر اعتراض ہوتا تھا تو ہم نے شیعوں کو چوڑی چوڑی سڑکوں پر اجازت دی مگر پھر بھی دنگا کروادیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ شیعہ حضرات کا حق تو بنتا ہی ہے کہ وہ جلوس اٹھائیں۔ ہم لوگ اس ملاقات میں ہوئی گفتگو سے اتنا مطمئن تھے کہ لگتا تھا کہ چہلم میں ہی جلوس اٹھ جائیں گے مگر چہلم آیا اور چلا گیا اور بس ہم لوگ احتجاج کرتے ہی رہ گئے۔

شیعوں اور سنیوں کے جلوسوں پر حکومت کا فیصلہ

رمضان المبارک کی خوشگوار آمد مسلمانوں کے لئے ایک مسرت کی کرن اپنے ساتھ

ساتھ لائی۔ ۳۰ جولائی ۱۹۸۱ء کو وی پی سنگھ کی سرکار نے ایک فیصلہ لیا جس میں شیعوں کے قدیمی جلوسوں کو بحال کرتے ہوئے سنّیوں کو بھی ایک جلوس بارہ وفات (عید میلادالنبی) کے موقع پر نکالنے کا حق دیا گیا۔ جس دن حکومت نے یہ فارمولہ جاری کیا اس دن ہم لوگ یو این آئی کے دفتر میں ایک اخباری بیان لے کر گئے ہوئے تھے۔ یو این آئی کے نمائندے نے ہم لوگوں سے اس پر رد عمل جاننے کی کوشش کی تو ہم نے کہا کہ ہم لوگ اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں دوسرے دن جب اخبار میں وشوناتھ پرتاپ سنگھ کا فارمولہ چھپا اور ساتھ میں ہمارا رد عمل بھی شائع ہوا تو شیعوں کے کئی لیڈروں کو بہت برا لگا سنّیوں ان میں بھی کچھ نے فارمولہ کو اچھا کہا اور کچھ نے برا کہا۔ مولانا طاہر جرولی صاحب نے تو میری کھل کر مذمت کی اور کہا کہ قوم کو نابالغ سیاست بہت نقصان پہنچا رہی ہے۔ بہر حال ہم لوگوں کی صدق دل سے کی جا رہی کوشش کو دونوں ہی فرقوں کی ہٹ دھرم قیادت نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ شیعوں کی طرف سے جوابی جلوس کی مانگ کی جا رہی تھی جبکہ سنّی بلا وجہ یہ رٹ لگا ئے تھے کہ ان کو پہلے ایک ٹیسٹ جلوس کی اجازت دی جائے۔ بعد میں شیعہ قیادت نے اپنے رویہ میں کافی لچک دکھائی مگر سنّیوں کی ہٹ دھرمی کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۱ء کو حضرت علی کو یوم شہادت کے سلسلے میں اٹھنے والے جلوسوں کے بارے میں ہم لوگوں کو یقین تھا کہ حکومت نئے فارمولے کے تحت ان جلوسوں کو ضرور اٹھوادے گی۔ مگر جلوس اٹھوانے کی ہمت سرکار میں نہیں تھی اس لئے یہ تاریخ بھی نکل گئی۔ ۲۱ رمضان کو میں نے اور سید کلب نقی نے سینکڑوں شیعوں کے ساتھ گرفتاری دی اور احتجاج کیا۔ ۳۰ جولائی ۱۹۸۱ء کو مولانا کلب عابد صاحب مرحوم مولانا کلب جواد صاحب اور علی کانگریس کے کئی عہدیدار ہم لوگوں سے جیل میں ملنے آئے اور بتایا کہ آج کل میں کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ دوسرے دن اخباروں میں خبر چھپی کہ شیعہ سنّی مسئلہ حل ہو گیا ہے اور اب اگلی نوچندی جمعرات تک جلوس ضرور اٹھ جائیں گے۔ اس دن رمضان کا آخری جمعہ تھا جیل میں مولانا رضوان صاحب ہم لوگوں کو نماز جماعت پڑھانے آئے اور رات دس بجے ہم لوگوں کو رہائی

ملی۔اس بار ہم لوگوں نے دل کھول کر عید منائی کیونکہ ہم لوگوں کی جدو جہد رنگ لارہی تھی۔ مگر نوچندی تو نوچندی اگلے دو مہینے تک فارمولہ لاگو نہیں ہوا تو اشرف حسین ایڈوکیٹ اپنا پرانا ہتھیار یعنی تحریک تبرہ لے کر میدان میں اتر آئے۔ علی کانگریس چونکہ تبرہ بازی کو بھی جھگڑے کی جڑوں میں سے ایک تسلیم کرتی تھی اس لئے ہم لوگوں نے کہا کہ ہم تبرہ کی تحریک میں شریک نہیں ہوں گے۔اور ہم لوگوں نے اشرف حسین صاحب کی تبرہ کی تحریک سے خود کو الگ رکھتے ہوئے صوبائی وزیر رانی بخشی کے گھر پر مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا اور حضرت محل پارک سے ہم لوگ پھر گرفتار ہوئے۔ ۴ ستمبر ۱۹۸۱ء کو لکھنؤ جیل میں ایک بار پھر ہم لوگوں کا بستر لگ گیا۔

اشرف حسین ایڈوکیٹ بہت خوش تھے کہ انھوں نے تبرہ پڑھ کر گرفتاری دی اور شہر میں فساد نہیں ہوا۔ یہیں جیل میں انھوں نے ہم لوگوں کو بتایا کہ کئی برس پہلے جب وہ عراق میں کربلائے معلّٰی کی زیارت کے لئے جارہے تھے تو ہوائی جہاز میں ان سے سی آئی اے نے رابطہ قائم کیا اور شیعہ سنّی مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے سی آئی اے کے ایجنٹ نے ان سے ملنے کی تمنا کا اظہار کیا تو بقول اشرف حسین صاحب انھوں نے انکار کردیا۔ شیعہ سنّی معاملہ میں سی آئی اے کی دلچسپی ایک عالمی سچ ہے اس لئے اشرف حسین صاحب کی بات پر یقین نہ کرنے کا جواز نہیں تھا۔ ٦ دسمبر ۱۹۸۱ء کو کسی شخص نے گدھے پر تبرہ لکھ دیا جس کے بعد فساد ہو گیا اور شہر میں کرفیو لگ گیا پولیس نے کچھ شیعوں کو اس حرکت پر گرفتار بھی کیا لیکن یہ کام سی آئی اے کے ایجنٹوں کا بھی ہو سکتا تھا اس کا ہم لوگوں کو بڑی حد تک یقین تھا۔ بہر حال ہم لوگ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۱ء کو جیل سے رہا ہو کر گھر پہنچے کچھ ہی روز بعد محرم آگیا ہم لوگوں کو یقین تھا کہ محرم تک مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا لیکن ایک طرف طاقت ور سنّی لیڈر شپ تھی تو دوسری طرف ضلع انتظامیہ میں جذبے کی شدید کمی اور تیسری طرف شیعہ لیڈر شپ کا بکھراؤ.... دو طاقتور چیزوں سے لڑنے کے لئے ایک طاقتور لیڈر شپ کا ہونا ضروری تھا مگر قوم کی لیڈر شپ بھلے ہی عوامی جلسوں میں ایک نظر آتی ہو اندر سے بکھری ہوئی تھی۔ کچھ لوگ علی کانگریس کو نیچا دکھانے کے لئے پوری شیعہ قوم تک سے غداری کرنے پر آمادہ تھے۔دوسری طرف سنّیوں کو بھی اپنے جلوس سے کوئی سروکار نہ تھا ان کو تو

صرف شیعوں کے جلوسوں کو روکنا تھا اس لئے وہ مدح صحابہ کے نام پر ضلع انتظامیہ کے ساتھ مل کر شیعوں کے جلوسوں کو روکتے رہے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو محرم شروع ہوا تو ضلع مجسٹریٹ نے ہم لوگوں سے کہا کہ حکومت کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی ہے اس لئے اس بار بھی جلوس نہیں نکلیں گے۔ ہم لوگ بہت رنجیدہ اور اداس تھے مگر ہم لوگوں نے ضلع مجسٹریٹ سے کہا کہ نئے لکھنؤ میں جو سنّی عزاداری تعزیہ اٹھاتے ہیں یا 'پیک' بن کر نکلتے ہیں ان کو کیوں روکا جاتا ہے تو اس پر ضلع مجسٹریٹ نے کہا اس پر شیعوں کی طرف سے اعتراض ہوتا ہے۔ اس جواب پر لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ بھلا کون شیعہ کسی کے تعزیہ پر اعتراض کرے گا؟ ہم لوگوں نے کہا کہ ہم پوری قوم کی طرف سے بہت ذمہ داری کیساتھ یہ لکھ کر دینے کو تیار ہیں کہ کسی کو بھی سنّیوں یا ہندوؤں کے تعزیہ مہانگر کی کربلا لے جائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس کے بعد سے لکھنؤ کی مہانگر کی کربلا اور دوسری کربلاؤں میں ہزاروں کی تعداد میں تعزیہ جانے لگے اس طرح تعزیہ داری مخالف سنّیوں کو ہم لوگوں نے کراری مات دی۔

پھر محرم آتا رہا اور ہم لوگ مظاہرے اور احتجاج کر کے گرفتاریاں دیتے رہے۔ پھر یہ سلسلہ سا چل نکلا اور کچھ برس بعد یہ رسم سی بن گئی کہ عاشور کے دن ہزاروں شیعہ گرفتاری دیتے اور بعد میں پولیس ان کو رہا کر دیتی۔

علی کانگریس نے ۱۰۱ء، نوں اپنی مصروفیات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا ہم لوگوں نے اسلامی دینیات پر کتابیں اور ایران کے اسلامی انقلاب کے متعلق لٹریچر شائع کرنے کا کام شروع کر دیا اپریل ۱۹۸۶ء میں ہم لوگوں نے پیام نو کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار چھاپنا شروع کیا مجھے اس کا ایڈیٹر بنایا گیا مگر میرے سرکاری نوکری میں چلے جانے کے بعد سابق لوک آیکت جسٹس مرتضٰی حسین صاحب کے صاحب زادے جاوید مرتضٰی اس کے لئے ایڈیٹر بنے۔ بعد میں جاوید مرتضٰی صاحب نے شیعوں کے جلوسوں کی تحریک کو محلّہ وار گرفتاریوں کی شکل میں ایک نئی ہمت کے ساتھ شروع کیا ضلع حکام اس نئی تحریک سے کافی پریشان بھی رہے۔ لیکن اس تحریک

کے خلاف خود کئی شیعہ لیڈر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ اس طرح کی تحریک سے امن وامان کی صورتحال بگڑ رہی ہے اور یہاں تک نوبت یہ آگئی کہ کاظمین سے گرفتاری دینے والوں کو خود شیعوں کے ہی نام نہاد قائدین نے روکنے کی کوشش کی یہ کام انھوں نے ضلع انتظامیہ کے کہنے پر کیایا نہیں اس بارے میں تو کچھ کہنا مناسب نہیں ہے ہاں اتنا ضرور ہوا کہ شیعوں کی تحریک پھر صرف عاشور کے دن بڑے امام باڑے سے دی جانے والی گرفتاریوں اور علم فاتح فرات اور شب عاشور کے علم میں پولیس کے ساتھ شیعہ نوجوانوں کی دھینگامشتی تک محدود رہ گئی۔

شیعہ لیڈر شپ بھی چین سے بیٹھ گئی ضلع انتظامیہ کو بھی سکون مل گیا اور سنّیوں کو بھی کامیابی مل گئی۔ عاشور کے دن گرفتاریوں کا پروگرام بھی صرف مولانا کلب عابد صاحب مرحوم کی بدولت چلتا رہا اور ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا کلب جواد کی اپیل پر شیعہ نوجوان خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرتے رہے اس کے برعکس کئی شیعہ لیڈروں نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا تھا کہ ہمیں سڑکوں پر جلوس نکالنے نہیں کی اجازت نہیں ہے تو کیا ہے؟ ہمارے پاس بڑی بڑی درگاہیں کربلائیں اور امام باڑے ہیں اس میں ہم لوگوں کو ماتم مجلس کرنا چاہئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۸۱ء پندرہ شعبان کو دریائے گومتی میں نکلنے والے بجرہ کے سلسلے میں پیش آیا ہم لوگوں نے ڈی ایم سے کہا کہ سڑک پر تو دفعہ ۱۴۴ لاگو ہے لیکن دریا پر تو نہیں اس لئے پندرہ شعبان کو بجرہ نکال کر اس پر نذر دینے کی اجازت ہم لوگوں کو دی جائے انھوں نے کہا کہ جو تنظیم یہ پروگرام کا اہتمام کرتی ہے اس کے سکریٹری صاحب کو بلا کر لایئے ہم لوگ مفتی گنج گئے وہاں سے انجمن ظہور امامت کے ایک عہدیدار کو بلا کر ڈی ایم کے پاس لے گئے تو انھوں نے کہا کہ لیجئے طاہر جرولی صاحب سے فون پر بات کیجئے۔

فون پر طاہر جرولی صاحب نے کہا کہ اگر فساد ہو جائے گا تو کیا ہوگا؟ ہمارے پاس حسین آباد کا تالاب موجود ہے اس میں بجرہ نکالئے نذر دیجئے دریا پر کرنے کی کیا ضرورت؟ تب ہم لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ سنّیوں کے ساتھ ساتھ شیعوں کی قیادت بھی مذہبی جلوسوں کی راہ میں ضلع انتظامیہ کے اشارے پر روڑے اٹکا رہی ہے۔ علمائے خاندان اجتہاد کے علاوہ کوئی بھی شیعہ

عالم دین یا مولانا جلو سہائے کے عزا پر لگی پابندی کے خلاف کوئی تحریک لے کر کیوں سامنے نہیں آیا یہ بھی ایک بہت اہم اور غور طلب سوال ہے۔

شیعہ سنّی ...... بدلتے رشتے

اس بیچ علی کانگریس نے شیعہ سنّی اتحاد کے لئے اپنی کوششوں کو جاری رکھا جماعت اسلامی اور اسٹوڈنٹ اسلامک مومنٹ کے ساتھ علی کانگریس نے ربط و ضبط بڑھانا شروع کر دیا۔ بابری مسجد کا تالہ کھلا اور اس میں مورتیاں رکھ کر پوجاپاٹ شروع ہوئی تو علی کانگریس نے سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف احتجاج کیا۔ مولانا کلب عابد صاحب جو شیعوں کے متفقہ طور پر سب سے بڑے رہنما بن چکے تھے بابری مسجد، مسلم پرسنل لاء اور بنارس کے قبروں والے معاملہ میں بہت زیادہ سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے علی کانگریس بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل رہی تھی اسی لئے انھوں نے ایک مجلس میں نو محرم کے مجمع میں کہا تھا کہ "علی کانگریس کے نوجوان میرے اعضاء و جوارح ہیں"۔

مولانا کلب عابد صاحب کی اتحادِ بین المسلمین کی پالیسی کے نتیجہ میں شیعہ اور سنّی فرقوں کے بیچ پھیلا ہوا تناؤ روز بروز کم ہوتا جارہا تھا مگر ۱۳ دسمبر ۱۹۸٦ء کو مولانا کلب عابد صاحب الہ آباد کے نزدیک ایک کار حادثہ میں جاں بحق ہوگئے۔ ان کے انتقال کی خبر سے نہ صرف شیعہ فرقہ سوگ اور رنج کے ماحول میں ڈوب گیا بلکہ سنّی فرقہ نے بھی زبردست پیمانے پر اظہارِ غم کرتے ہوئے ان کے جنازہ میں نہ صرف لاکھوں کی تعداد میں شرکت کی بلکہ مولانا کلب عابد صاحب مرحوم کے جنازہ کو سنّیوں کے طریقے سے نماز جنازہ ادا کرنے کے لئے ٹیلہ والی مسجد لے جایا گیا لکھنؤ کے شیعہ سنّی قضیہ کی مکروہ تاریخ میں یہ ایک ایسا حسین منظر تھا جس کے لئے اسلامی اتحاد نہ جانے کب سے تڑپ رہا تھا۔ ٹیلہ والی مسجد پر اب تک ہزاروں سنّیوں کی نماز جنازہ تو ادا کی گئی تھی لیکن کسی شیعہ کے لئے یہ ایسا اعزاز تھا جو کسی کو حاصل نہیں ہوا تھا خاندان اجتہاد کے تمام لوگ اس منظر کو نمناک آنکھوں سے دیکھ کر اپنے اس سپوت پر ناز کررہے تھے جو

آئمہ اطہار کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی اتحاد کی جڑوں کو مضبوط کر کے اس دنیا سے سدھارا تھا۔
سب سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ ٹیلہ والی مسجد کے چاروں طرف علم سجے ہوئے کھڑے تھے اور کسی سنّی کو کوئی اعتراض نہ تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ علم کے جلوس صرف محبت اتحاد و اتفاق کی فضا میں ہی اٹھ سکتے ہیں۔

ادھر ایران میں امام خمینی نے سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب شیطانی آیات کے خلاف فتویٰ صادر کیا تو سنّیوں کے دلوں کا شیعوں کے لئے وہ غبار بھی کافی کم ہو گیا جو ۱۹۸۰ء میں ایران پر عراق کے حملہ کے دوران دماغوں پر چھا گیا تھا۔ عراق ایران لڑائی کو مغربی ذرائع ابلاغ نے شیعہ سنّی جنگ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور ایران کے اسلامی انقلاب کو ایک شیعہ انقلاب اور صدام حسین کے جارحانہ عزائم کو ایک سنّی قائد کی لشکر کسی سے تعبیر کر کے مغربی میڈیا نے دنیا کو خوب خوب گمراہ کیا تھا امریکہ کی نظر میں اس زمانے میں صدام حسین ایک راسخ العقیدہ سنّی مسلمان اور امام خمینی ایک کٹر شیعہ قائد تھے۔ مگر جب کیمائی ہتھیاروں کے استعمال اور انسانوں کو ہلاک کرنے والی زہریلی گیس کے ذریعہ عراق نے درندگی اور بربریت کی انتہا کر دی تو ایران نے جنگ بندی قبول کرلی تو شیعہ سنّی رشتے بھی آسانی سنورنے لگے۔

۴جون ۱۹۸۸ء کو ایران میں امام خمینی کا انتقال ہوا اور لکھنؤ کے شیعوں نے ایک ماتمی جلوس نکالنا چاہا تو سنّیوں نے کوئی اعتراض نہ کر کے اسلامی اتحاد کو اور زیادہ تقویت بخشی۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد تو لکھنؤ میں شیعہ سنّی فرقوں کے بیچ ایسا مثالی اتحاد قائم ہوا تھا کہ شیعوں کو لگتا تھا کہ اب کی علم کے جلوس اٹھ ہی جائیں گے۔ بابری مسجد خود تو شہید ہو گئی تھی مگر سنّیوں اور شیعوں کو اپنی قربانی سے بڑی حد تک قریب کر گئی تھی۔ ۶ دسمبر کو شیعہ سنّی علاقوں میں ایک ہی جیسا ماحول تھا سب ہی سوگوار تھے مگر صرف وہ چہرے غائب تھے جو شیعہ اور سنّی فرقوں کو لڑوا کر اپنی جیب بھرتے آئے ہیں۔ کرفیو ہٹتے ہی علی کانگریس نے امام باڑہ زین العابدین خاں میں ایک جلسہ کیا جس میں آگے کی حکمت عملی کے بارے میں فیصلہ کیا جانا تھا اس جلسہ میں شیعوں سے زیادہ سنّی فرقہ کے لوگ آگئے اس بات سے حوصلہ پا کر علی کانگریس کے

صدر سر راجاوید مرتضٰی نے ۲۵ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بڑے امام باڑے میں ایک جلسہ عام کا انعقاد کیا جس میں مسلمان جوق در جوق اُمڈ پڑے۔ علی کانگریس اسلامی اتحاد کو تقویت دینے والے ہر کام میں مسلمانوں کی حمایت کر رہی تھی اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے باطل کی طاقتوں سے حمایت لینے سے بھی گریز رہی تھی یہاں تک کہ ایک بار محرم کے جلوسوں پر گرفتاری کے دوران لکھنؤ کی شیو سینا برانچ نے شیعوں کے ساتھ مل کر گرفتاری دینے کا اعلان کیا اور ان کے کارکنان آئے بھی مگر شیعوں نے ان سے مدد نہیں لی کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ شیو سینک شیعوں کی محبت میں ایسا کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ وہ شیعہ سنّی جھگڑے کو ہوا دینا چاہتے ہیں ورنہ عزاداری کے جلوسوں پر لگی پابندی کے خلاف وہ لوگ اتنے دن تک کیوں خاموش رہے؟

دوسرے شیعہ قائدین کی طرف سے کبھی کوئی احتجاجی تحریک شروع کرنے کا کوئی اعلان نہ تو ہوا نہ انہوں نے اظہار کیا کہ وہ احتجاج کرنے کا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں صرف مولانا کلب عابد صاحب کے صاحب زادے مولانا کلب جواد کی طرف سے جلوسہائے کے ۲۰ا پر لگی پابندی کے خلاف احتجاج تحریک چل رہی تھی اور وہ بھی عاشور کے دن گرفتاریوں تک ہی محدود تھی

۱۹۹۲ء میں اتر پردیش میں اسمبلی الکشن سے قبل شیعوں کے ایک گروہ نے عزاداری کانفرنس کی اور اس میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر لال جی ٹنڈن سمیت کئی مغرز لوگ شامل تھے مسٹر ٹنڈن نے شیعوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ان کی سرکار کو یوپی میں اقتدار حاصل ہوا تو وہ شیعوں کے جلوس ضرور اٹھوا دیں گے۔ لیکن جب ۱۹۹۷ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی کی ملی جلی سرکار بنی تو لال جی ٹنڈن کی بھارتیہ جنتا پارٹی اپنے کئے ہوئے وعدہ سے مکر گئی۔

اس وعدہ فراموشی سے مایوس ہو کر دو شیعہ نوجوانوں پپو اور بھوپالی نے درگاہ حضرت عباس کے قریب چل رہے احتجاجی دھرنے کے دوران خود سوزی کر لی ۱۰ مارچ ۱۹۹۷ء کو ان دونوں نے خود پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی اور انھیں شدید زخمی حالت میں دہلی کے صفدر جنگ اسپتال بھیجا گیا۔ ان دونوں مایاوتی کی سرکار تھی اس کو نہ تو شیعہ سنّی معاملہ کا کچھ علم تھا نہ

اس کے حل کرنے کی کوئی فکر تھی۔ اس کو کسی نے سمجھا دیا تھا کہ یہ سب شیعہ عالم دین مولانا کلب صادق صاحب کے شہہ پر ہو رہا ہے جن کے ملائم سنگھ یادو سے گہرے تعلقات ہیں۔ مایاوتی نے خود سوزی کے معاملے کے بعد شیعوں کے مطالبات پر دھیان دینے کے بجائے پوری شیعہ قوم کو ہی ملائم سنگھ یادو کے ہاتھوں کا کھلونا سمجھ لیا اور شیعوں کے زخموں پر اس طرح نمک پاشی کی کہ دونوں نوجوانوں کی لاشوں کو بھی لکھنؤ میں لا کر دفن کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد ایک اور شیعہ نوجوان نے خود سوزی کر لی۔ شیعوں میں کرب و بےچینی بڑھتی جا رہی تھی مگر مایاوتی سیاست کھیل رہی تھی۔ اس بیچ تینوں نوجوانوں کے غم میں شیعوں نے ایک ماتمی جلوس نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا اور شیعوں کا ایک وفد مایاوتی سے ملنے گیا تو ہندوستان میں پہلی بار کسی وزیر اعلیٰ نے شیعہ وفد کے ساتھ بدتمیزی سے بات کی اور مولانا کلب صادق صاحب جیسے بین الاقوامی شہرت کے رہنما سے شایان شان طریقے سے گفتگو نہیں کی مگر مایاوتی جیسے سیاسی لیڈروں کی بدکلامی اور بدتمیزی کا شکوہ کیا؟ انھوں نے شائد پرورش ہی ایسے ماحول میں پائی ہے جہاں تہذیب و تمیز کا دور دور تک کوئی نشان بھی نہ تھا۔ پھر مولانا کلب صادق صاحب کی طرف سے یہ کہہ دینے کے بعد جلوس تو اٹھ کے رہے گا مایاوتی کو مجبوری میں جلوس کی اجازت دینا ہی پڑی۔ اس کے بعد بھی مایاوتی شیعوں کے خلاف بولتی رہی اور کسی بھی شیعہ وفد سے اس نے ملاقات نہیں کی جبکہ شیعوں کی مایاوتی سے کوئی ذاتی لڑائی تھی ہی نہیں۔

کلب ۔ ادکی انقلابی تحریک

خاندان اجتہا کے نام سے پہچانے جانے والے جس خاند ر ے، مولانا کلب جواد صاحب کا تعلق ہے اس نے پچھلے دو سو سال کی تاریخ میں کبھی بھی سیاست میں حصہ نہیں لیا یا سیاسی لوگوں سے فوائد یاصل نہیں ئے اور جب تک سیاست نے مذہب میں مداخلت نہیں کی علمائے خاندان اجتہاد درس و تدریس اور تبلیغ دین میں لگے رہے لیکن جب جب سیاست نے

مذہب میں مداخلت کی خاندان اجتہاد کے علماء ہی سید ان میں نظر آئے۔ نواب آصف الدولہ کی بھنگ کا نشہ کرنے کی عادت ہو یا نصیر الدین شاہ جیسے شیعہ بادشاہ کی غیر اسلامی رسموں اور بدعتوں کے ذریعہ شیعت کی تصویر مسخ کرنے کی کوشش بڑے امام باڑے اور ٹیلے والی مسجد کو انگریزوں کے قبضہ سے آزاد کروانے کی جدوجہد ہو اذان میں ولایت حضرت علی کے اعلان کا معاملہ ہو یا بابری مسجد اور مسلم پرسنل لاء جیسے اہم مسلم معاملات سب تحریکوں میں خاندان اجتہاد کے علماء ہی سامنے نظر آئے۔

مولانا کلب جواد صاحب کے والد مولانا عابد صاحب مرحوم تمام عمر مسلمانوں کی تحریکوں سے وابستہ رہے۔ شاہ بانو کیس کے بعد مسلم پرسنل لاء کی بحث رہی ہو یا بنارس کے شیعہ قبرستان سے سنّی قبروں کو ہٹائے جانے کا عدالتی فیصلہ مولانا کلب عابد صاحب پوری مستعدی کے ساتھ اپنا کردار نبھاتے رہے اس معاملہ میں تو سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد بھی سنّیوں کی قبریں نہیں ہٹیں کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں سینکڑوں شہروں میں سنّیوں کی ملکیت والے قبرستانوں میں شیعہ مدفون ہیں دو سنّی قبریں ہٹائی جاتیں تو نہ جانے کتنی شیعہ قبریں اسی فیصلہ کی نذیر کے تحت ہٹائی جاتیں اس کا اندازہ بھی لگانا مشکل تھا۔ مولانا کلب عابد صاحب اپنی عمر کے آخری لمحوں تک آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر بھی رہے۔ مولانا کلب عابد صاحب کی ایک تقریر کے اس اقتباس سے ان کی شخصیت کی بلندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے " ہم پہلے انسان ہیں...... پھر مسلم ہیں اور پھر شیعہ ...... جب انسانوں پر کوئی مصیبت آئے گی تو ہم ان کا ساتھ دیں گے جب مسلمانوں پر ظلم ہوگا ہم ان کی حمایت کریں گے اور جب شیعوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی تو اس کی بھی مخالفت کریں گے "۔ شائد ان ہی خیالات کی وجہ سے نہ صرف لاکھوں مسلمانوں نے ان کے جنازہ شرکت کی بلکہ بڑی تعداد میں ہندو بھی شامل ہوئے موجودہ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی بھی ان کے گھر پر تعزیت ادا کرنے کے لئے گئے ان کے علاوہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ ملائم سنگھ یادو نرائن دت تیواری محمد عثمان عارف، محسنہ قدوائی اور تقریباً سب ہی مسلمان علمائے دین ان کے انتقال پر تعزیت کے لئے آئے۔ مگر خاندان اجتہاد کے لئے

۱۷جون کو حضرت عثمان کا قتل ہوا تھا اور اس کے پانچ دن کے بعد عوام کے شدید اصرار پر حضرت علی نے ۲۳جون ۶۵۴ء کو اسلامی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس طرح ایک بار پھر اسلامی سلطنت پیغمبر حضرت محمد کے خاندان میں واپس آگئی۔

حضرت علی کے تخت نشیں ہونے کے بعد انتقام قتل عثمان کے نعرہ بلند ہونے لگے۔ اور وہ طاقتیں، جو حضرت عثمان کو خاموشی سے قتل ہوتے دیکھتی رہی تھی آج حضرت عثمان کے قتل کا بدلہ لئے جانے کے نام پر ایک نیا فتنہ کھڑا کرنے کے درپے تھیں۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے حضرت عائشہ ام المومنین کو بھڑکایا گیا اور مسلمانوں میں کشت وخون قتل و غارت گری کا دور شروع ہو گیا ابھی حضرت علی کو عنان حکومت سنبھالے ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ حضرت عائشہ اور حضرت علی کی افواج میں معرکہ آرائی ہو گئی۔ خود ام المومنین اپنے دیور حضرت علی کے مقابلے میں میدان جنگ میں آگئیں اور مسلمانوں کو پہلی باہمی جنگ کا شکار ہونا پڑ گیا۔ جنگ جمل کے نام سے مشہور اس جنگ میں حضرت عائشہ کو شکست ہوئی مگر حضرت علی نے حضرت عائشہ کے احترام میں کوئی کمی نہ آنے دی اور انھیں عزت و توقیر کے ساتھ ان کے بھائی محمد بن ابو بکر کی حفاظت میں مدینہ واپس بھیج دیا۔ حضرت عائشہ نے اس شکست کے بعد عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اس کے بعد شام کے گورنر امیر معاویہ نے حضرت علی لی اسلامی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ صفین کے نام سے مشہور ایک مقام پر حضرت علی اور امیر معاویہ کی افواج کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی اس جنگ میں جب حضرت علی کی افواج بالکل فتح کے قریب پہنچ گئیں تو اسی وقت امیر معاویہ کی افواج نے نہایت چالاکی کے ساتھ نیزوں پہ قران بلند کر کے صلح کی پیشکش کی۔ گو کہ حضرت علی اس چال کو سمجھتے تھے مگر حضرت علی کے کچھ سپاہی اپنے آپ کو (معاذاللہ) حضرت علی سے زیادہ عقل مند سمجھتے تھے۔ انھوں نے امیر معاویہ کی صلح کی شرط قبول کرنے کے لئے حضرت علی پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ مجبور ہو کر صلح کی گفتگو پر آمادہ ہو گئے۔ مگر اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا جس سے حضرت علی واقف تھے۔ پھر حکم بنائے جانے کے معاملہ کو لے

سب سے بڑا اعزاز تھا...... اتحاد اسلامی...... اور سب ہی اہل خاندان اپنے اس اعلیٰ صفات فرد پر فخر کر رہے تھے جس کی یاد میں ٹیلہ والی مسجد پر جلسہ اتحاد منعقد ہو رہا تھا اس کتاب میں کئی جگہ پر ٹیلے والی مسجد کا ذکر شیعہ سنی فساد کے سلسلے میں تحریر ہوا ہے لیکن مولانا کلب عابد صاحب کی یاد میں ان کے چہلم پر منعقد ہونے والا جلسہ ایک نئی تاریخ تحریر کر رہا تھا جس سے اتحاد کی کرنیں پھوٹ کر تمام شہر کو منور کر رہی تھیں۔

مولانا کلب جواد صاحب کو ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کا جانشین بنایا گیا تو ان کو اعلی مذہبی و دینی تعلیم کے لئے ایران کے دینی شہر قم جانا پڑا ۱۹۸۷ء سے اب تک وہ قم میں ہی زیر تعلیم ہیں اور صرف رمضان المبارک اور محرم کے مہینوں میں ہندوستان تشریف لاتے ہیں ہندوستان میں محرم کی مجلسیں پڑھنے کے علاوہ وہ شیعوں کی عاشورہ والی تحریک چلاتے آرہے ہیں۔ گزشتہ دس برسوں میں شیعوں کی احتجاجی تحریک صرف دس محرم تک محدود رہ گئی تھی کیونکہ کچھ شیعہ قائدین نے ہی یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ ہمارے پاس اتنے بڑے بڑے امام باڑے اور درگاہیں و کربلائیں ہیں اس کے اندر عزاداری کی جانا چاہئے باہر جلوس نکالنے کی کیا ضرورت مگر نئی شیعہ نسل جب جب دوسری قوموں کے جلوس نکلتے ہوئے دیکھتی تو اس کو احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے اسی مایوسی اور اضطراب کے عالم میں دو شیعہ نوجوانوں نے دس اپریل ۱۹۹۷ء کو (بقرید سے ایک ہفتہ قبل نوچندی جمعرات کو) اپنے جسم پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا کر ساری شیعہ قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور شیعہ قوم کے نوجوان ایک نئے سرے سے جلوسہائے عزا کی بحالی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر ان کے پاس قیادت کے لئے کوئی ایسا چہرہ نہیں تھا جس پر وہ کھلے دل سے اعتبار کر سکیں۔ ضلع انتظامیہ سے ملی بھگت رکھنے والے قائد ایک طرف تھے سیاسی پارٹیوں کی ٹوپیاں اپنے عماموں کے نیچے چھپائے علماء کا ایک گروہ دوسری طرف تھا ایسے میں شیعہ قوم کی نگاہیں خاندان اجتہاد کے اہم ترین عالم دین مولانا کلب صادق صاحب کی طرف اٹھیں جنھوں نے بقرعید کے جلوس کے لئے بہت کوشش کی تھی اس جلوس میں خدا کا شکر ہے کہ بہت سے علماء نے شرکت کی مگر مولانا صادق صاحب کے بیرون

وطن چلے جانے کے بعد کوئی ایسا شیعہ عالم دین سامنے نہیں آیا جو شیعوں کی قیادت کرتا۔ محرم کے قریب مولانا کلب جواد صاحب آئے تو شیعہ قوم کی پر امید نگاہیں ان پر ٹھہر گئیں۔ عاشور کا احتجاج پر امن طور پر گزر گیا لیکن شیعہ مطمئن نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ بڑے پیمانے پر احتجاجی تحریک شروع کی جائے۔ مولانا کلب جواد صاحب نے شیعہ فرقہ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اپنی تحریک کو آگے بڑھائیں گے لیکن اسلامی اتحاد پارہ پارہ نہ ہو اس کی بھی وہ پوری کوشش کریں گے۔ مولانا کلب نے جواد صاحب دہلی کی جامع مسجد کے شاہی امام حضرت مولانا عبداللہ بخاری سے رابطہ قائم کیا اور لکھنؤ کے شیعہ سنّی مسئلہ کو حل کئے جانے کے سلسلے میں ان کی غیر متنازعہ شخصیت سے مدد مانگی مولانا بخاری صاحب کا احترام شیعہ اور سنّی دونوں فرقوں کے لوگ یکساں طور پر کرتے ہیں اس لئے مولانا کلب جواد صاحب کو یقین تھا کہ ان کے بیچ میں پڑنے سے شہر میں تناؤ بھی نہیں پھیلے گا اور شیعوں کے جلوسوں کی بحالی کا کوئی راستہ سنّی لیڈر شپ کے ساتھ بات چیت کے ذریعہ نکل آئے گا۔ مولانا کلب جواد نے لکھنؤ کے کئی سنّی قائدین سے بھی رابطہ قائم کیا شہرۂ آفاق درگاہ شاہ میناشاہ کے سجادہ نشین قمر مینائی اور دوسری سنّی لیڈروں کو اپنے ساتھ لے کر جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ ادھر دہلی سے رابطہ قائم کرنے کے بعد مولانا سید عبداللہ بخاری نے یقین دہانی کروائی کہ وہ عزاداری کے جلوسوں کی بحالی کے لئے ہر ممکن تعاون دیں گے۔

سرگرم شیعہ کارکن اور انجمن رضاکاران حسینی کے جوائنٹ سکریٹری عباس نگار مولانا سید عبداللہ بخاری اور شیعہ جامع مسجد دہلی کے امام سید علی تقوی صاحب اور دوسرے مسلم لیڈروں کو اپنے ہمراہ پہلی جون ۱۹۹۷ء کو لکھنؤ لائے۔ لکھنؤ کے مسلمان مولانا کے خیر مقدم کے لئے ٹوٹ پڑے...... مولانا نے شیعہ سنّی لیڈروں سے بات چیت کرنا شروع کر دی۔ اسی بیچ پاٹانالہ کے مشہور مولوی عبدالشکور کے پوتے مولانا عبدالعلیم فاروقی سے بھی مولانا بخاری صاحب نے ملنے کا پروگرام بنایا وہاں کئی دوسرے سنّی لیڈر بھی موجود تھے جب مولانا بخاری صاحب نے گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کہا تو مولانا عبدالعلیم فاروقی نے کہا "شیعہ تو

کافر ہیں کافروں سے گفتگو کیسی؟" اس پر مولانا سید عبداللہ بخاری نے کہا کہ "اگر شیعہ کافر ہیں تو سعودی سرکار انہیں خانۂ کعبہ کا طواف کرنے کی اجازت کیسے دیتی ہے"۔ اس سوال پر مولانا بغلیں جھانکنے لگے لیکن پھر مولانا عبدالعلیم فاروقی نے شیعوں کے متعلق اپنے عقائد کا اظہار رکیک انداز میں کیا تو مولانا بخاری صاحب طیش میں کھڑے ہوگئے اور بات چیت ادھوری چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ دراصل مولانا عبدالعلیم فاروقی کے پاس خود کو مسلمان ثابت کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ شیعوں کو کافر کہیں پاکستان کی سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوں بھی اسی مرض کا شکار ہیں۔ اپنے کردار اپنے حسن سلوک اپنی رحمدلی اور اخلاق سے دنیا کا دل جیتنے والے پیغمبر حضرت محمد کا نام لینے والے ان مسلمانوں کے پاس نہ دل دردرد مند ہے نہ حسن سلوک و اعلیٰ اخلاق بلکہ ان لوگوں کی ہی تقاریر سے مسلمان ہلاکت میں پڑتے ہیں ایسے عالم میں اگر یہ دوسرے کو کافر نہ کہیں تو ان کو مسلمان کون سمجھے گا؟

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آزاد بھارت کے آزاد شہریوں کے مذہبی حقوق پامال کرنے والے مولانا عبدالعلیم فاروقی جیسے مولویوں کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہے اور ان ہی لوگوں کے اشارے پر مولانا عبداللہ بخاری جیسے بین الاقوامی شہرت کے حامل عالم دین کو گرفتار کرلیا گیا شیعوں نے اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا تو مولانا کو رہا کر کے زبردستی دہلی بھیج دیا گیا۔ لیکن مولانا بخاری شیعوں سے وعدہ کر کے گئے تھے کہ وہ چہلم کے موقع پر ضرور لوٹ کر آئیں گے اور جلوس اٹھوائیں گے۔ اس بیچ مایاوتی نے معاملے کو حل کرنے کے بجائے پارکوں کے افتتاح چوراہوں کی تعمیر اور مورتیاں نصب کرنے میں ہی سارا وقت ضائع کر دیا اس کو شیعوں کے جذبات سمجھتے ہوئے مذہبی معاملات حل کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی؟

۲۵ جون ۱۹۹۷ء کو مولانا بخاری صاحب صبح کو دہلی سے پھر روانہ ہوئے ان کے ساتھ شیعہ جامع مسجد کے امام سید علی تقوی اور دوسرے رہبر بھی تھے مگر راستے میں ہی یوپی سرکار نے ان کو ٹرین سے اتروالیا۔ لکھنؤ میں اس کی خبر پہنچی تو شیعوں نے ان کی رہائی کی مانگ کرتے ہوئے کہا کہ مولانا کو فوراً رہا کیا جائے ورنہ شیعہ سڑکوں پر اتر آئیں گے۔ ۲۶ جون ۱۹۹۷ء کو چہلم تھا

اسی دن شیعوں نے اپنی احتجاجی تحریک کا اعلان بھی کیا تھا مولانا بخاری صاحب کے گرفتار ہونے کے سبب اس تحریک میں اور زیادہ جوش پیدا ہو گیا سرکار نے صبح سے ہی شہر میں کرفیو لگا دیا تھا لیکن حسب اعلان ٹھیک ایک بجے دن کو شیعہ مرد عورتیں اور بچے اپنے رہنما مولانا کلب جواد کی قیادت میں سڑکوں پر اتر آئے۔ تمام شہر میں ایک ساتھ یا حسین یا حسین کی صدائے بلند ہونے لگیں نہتے لوگوں پر پولیس نے آنسو گیس لاٹھی چارج فائرنگ اور بید چارج کر کے ان کے مذہبی جذبات کو کچلنا چاہا۔ مگر شیعوں نے جوابی کاروائی نہیں کی کیوں کہ ان کے قائد مولانا کلب جواد نے کہہ دیا تھا کہ ہم ظلم کرنے نہیں ظلم سہنے نکل رہے ہیں۔ نہتے شیعہ لاٹھیاں کھاتے رہے مگر ان کے ہونٹوں پر شکوے شکایت کی جگہ 'یا حسین یا حسین' کے نعرے تھے۔ مایاوتی کی ہٹلر والی پالیسیوں کے تحت شیعہ عورتوں پر بھی لاٹھی چارج کیا گیا مگر سب بے اثر رہا تقریباً دس ہزار شیعہ گرفتار ہوئے تب بھی حالات پر قابو نہیں پایا جا سکا تو ضلع انتظامیہ نے مولانا کلب جواد سے ہی مدد مانگی۔

دوسری طرف گرفتار شدہ افراد کو ۲۰ گھنٹے تک بھوکا پیاسا رکھا گیا خواتین اور مرد تو پھر بھی سہہ گئے مگر چھوٹے چھوٹے بچوں کو برا حال تھا کئی عورتوں کی گود میں دودھ پیتے بچے بھی تھے ان کی حالت تو اور بھی زیادہ قابل رحم تھی...... اس کی اطلاع ہم لوگوں نے حقوق انسانی کمیشن کو روانہ کتنی اور اسی کمیشن کی فوری مداخلت کی وجہ سے رات ڈھائی بجے کے قریب سب ہی شیعہ عورتوں اور بچوں کو رہا کر دیا گیا۔ اس احتجاج میں خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے والوں میں میری ستر سالہ ماں اور پانچ سال کی بھانجی اور چھوٹے چھوٹے بھتیجے بھی شامل تھے اور ان کے ساتھ ہزاروں شیعہ عورتیں اور بچے بھی اپنے مذہبی حقوق کی بحالی کے لئے لڑ رہے تھے مگر مایاوتی کے ہونٹوں پر ایک ہی رٹ تھی کہ یہ سب ملائم سنگھ یادو کے اشارے پر ہو رہا ہے۔ اصل میں مایاوتی جیسے سیاسی لیڈروں کے پاس نہ تو سمجھ ہے نہ معاملہ فہمی...... یہ لوگ تو سماج میں نفرت کے بیج بو کر ذات پات کی فصل کاٹنے میں ماہر ہیں۔ ان کو صرف گدی چاہئے اور وہ چاہے ان طاقتوں کے سہارے ہی کیوں نہ ملے جس کو وہ منواوِدی کہہ کر برا کہتے رہے ہیں۔ مایاوتی نے لکھنؤ کے مذہبی معاملہ کو سیاسی

بنانے کی پوری کوشش کی لیکن ہر بار اس کو ناکامی ہی ملی تنگ آکر اس نے ضلع مجسٹریٹ اور پولیس کپتان کا ٹرانسفر کردیا۔

مولانا کلب جواد کی گرفتاری

نئے ضلع مجسٹریٹ اور کپتان پولیس نے اس احکامات کے سائے میں عہدہ سنبھالا کہ ان کا پہلا کام ہے مولانا کلب جواد کو گرفتار کرنا۔ ۲۹ جون ۱۹۹۷ء کو صبح تین بجے مولانا کلب جواد صاحب کے گھر کو پولیس، پی اے سی، ریپڈ ایکشن فورس اور ضلع حکام کی ٹیم نے گھیر لیا۔ بڑی بڑی سیڑھیاں لگا کر پولیس چھتوں پر چڑھ گئی ایسا لگتا تھا کہ کسی مذہبی رہنما کو نہیں کسی شاطر مجرم کو پکڑنے کی تیاری ہو رہی ہے یا پھر کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ حالانکہ ضلع حکام چاہتے تو مولانا کو ٹیلی فون سے تھانے بلا کر بھی گرفتار کر سکتے تھے لیکن ڈرامائی انداز سے گرفتار کرنے کے پیچھے مایاوتی کا حکم بھی شامل تھا وہ صرف مولانا کو گرفتار کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ ان کے باعزت خاندان کی پردہ دار خواتین کی بے پردگی کا سامان بھی کرنا چاہتی تھی مگر مایاوتی کو کیا علم تھا جس کو اللہ عزت دے اس کو کوئی بے عزت نہیں کر سکتا مولانا کلب جواد کو قومی سلامتی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے خصوصی ہیلی پیڈ پر لے جایا گیا جہاں ان سے ضلع مجسٹریٹ نے درخواست کی کہ وہ شیعوں کے نام ایک پرچہ تحریر کریں جس میں امن وامان قائم رکھنے کی اپیل ہو۔ یہی تھا مایاوتی کا شکست نامہ کہ جس شخص کو قومی سلامتی ایکٹ میں گرفتار کیا گیا تھا اسی سے سلامتی کی بھیک مانگی جا رہی تھی۔ اس کے بعد مولانا کو یوپی سرکار کا خصوصی ہیلی کاپٹر للت پور جیل کی طرف لے کر چل دیا ادھر محلّہ محلّہ میں پولیس کے ہرکارہ مولانا کلب جواد کی وہ اپیل تقسیم کرتے نظر آرہے تھے جس میں مولانا نے اپنی گرفتاری پر کسی قسم کا احتجاج نہ کرنے کی اپیل کی تھی۔ اس طرح ڈرامائی گرفتاری سے شیعوں میں رنج وغم کا ماحول چھا گیا کیونکہ وہ تو اپنے لیڈر کی گرفتاری کے خلاف جان نچھاور کرنے کو تیار تھے۔ ۲۰ سالہ جدوجہد میں یہ پہلا موقع تھا کہ شیعہ قوم میں اس قدر اتحاد واتفاق دکھائی پڑ رہا تھا۔

پھر بھی کچھ سیاسی دلال ایسے تھے جو شیعہ قوم کی طرف سے اس گرفتاری کے خلاف
کوئی بڑا احتجاج نہ ہونے پر مایاوتی کو ٹیلی فون پر مبارکباد دیتے نظر آئے "دیکھا بہن جی میں تو پہلے
ہی کہتا تھا یہ قوم مولا پر جان تو دے سکتی ہے مولانا پر نہیں......" مگر ٹیلی فون کرنے والے دلال
کے بارے میں تو سب ہی جانتے تھے کہ وہ تو صرف پیسہ پر جان دیتا ہے۔ لیکن ابھی تہنیت اور
مبارکباد کا سلسلہ تمام بھی نہیں ہوا تھا کہ شیعہ پھر سے میدان میں اتر آئے فائرنگ آنسو گیس اور
کرفیو کا دور شروع ہو گیا ساتھ ہی ساتھ پورے ملک میں اس گرفتاری کے خلاف مظاہرے
شروع ہو گئے سب سے پہلا مظاہرہ انجمن ولی عصر اور شیعہ سنّی ایکتا کمیٹی نے دہلی میں پارلیمنٹ
کے قریب کیا۔ اس کے بعد تو ساری دنیا سے مظاہروں کی خبریں اور احتجاجی خطوط، فیکس اور تار
صدر اور وزیر اعظم کے دفتروں میں پہنچنے لگے۔ ایک چھوٹی سی چنگاری کو مایاوتی کی پالیسی نے اس
طرح بھڑکایا کہ یوپی کے تقریباً ہر شہر میں احتجاجی جلوس اور مارچ نکلنے لگے۔ ہندوستان بھر کے
تمام بڑے شہروں میں احتجاجی جلسے ہوئے اور تجاویز یوپی کی سرکار کو روانہ کی جانے لگیں۔ مولانا
کلب جواد کو ایک عام قیدی سے بھی زیادہ بری حالت میں رکھ کر مایاوتی نے اپنی چھوٹی ذہنیت کا
ثبوت دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا مگر اس کو کیا معلوم کہ شیعوں کے آئمہ طاہرین کو تو اس سے
بھی زیادہ سختیوں سے گزرنا پڑا تھا اور مولانا کلب جواد تو ان ہی کے ذاکر ہیں اس لئے بھلا وہ جیل کی
سختیوں سے کہاں گھبرانے والے ہیں۔ اس بیچ شیعوں نے ۴ جولائی ۱۹۹۷ء کو ایک بڑے
مظاہرے کا اعلان کر دیا۔ شہر میں کرفیو نافذ تھا جمہوری ملک کی پولیس نے برٹش لہجے میں انتباہ دیا
کہ کرفیو توڑ کر نکلنے والے افراد کو ہم گرفتار نہیں کرینگے بلکہ ان پر لاٹھی چارج کر کے ہاتھ پیر توڑ
دینگے اگر تب بھی وہ نہیں مانے تو ہم ان پر گولی چلائیں گے لیکن شیعہ ہار ماننے والے کہاں تھے؟ ان
کے لئے عزاداری کے بغیر زندہ رہنا ایک عذاب ہے عزاداری کے لئے مر جانا تو ان کی صدیوں کی
تاریخ ہے۔ اسی دن دہلی میں بھی ایک نئی تاریخ لکھی جا رہی تھی جب شیعہ سنّی اتحاد کمیٹی کی
آواز پر شیعہ اور سنّی ایک ساتھ مل کر جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کر رہے تھے اس شاندار مظاہرہ
کے بعد مولانا سید عبداللہ بخاری کی قیادت میں ایک شاندار جلوس نکلا جو پرانی دہلی کی سڑکوں

سے ہوتا ہوا پارلیمنٹ اسٹریٹ جاکر ختم ہوا اور پھر ایک وفد وزیر آعظم کے دفتر میں گیا جس کو وہاں پر موجود افسران نے یقین دہانی کروائی کہ مولانا کلب جواد ۴۸ گھنٹے کے اندر رہا کردیئے جائیں گے۔

شاندار احتجاج

ادھر لکھنؤ والوں کے لئے بھی ۴جولائی کا دن امتحان کا دن تھا مولانا کلب جواد کے اعلان کے مطابق اس دن جلوس علم نکلنا تھا مگر وہ خود جیل میں تھے مگر ان کے پروگرام پر عمل در آمد کرنے والے سب ہی لوگ جیل میں تھے۔ مولانا کے چھوٹے بھائی سید کلب نقی ان کے ساتھی الیسار ضوی ذوالکفل رضوی شرف زیدی اور شمیل شمسی سمیت سب ہی لوگ گرفتار ہو چکے تھے اور ان پر مایاوتی کے حکم سے ۳۰۷ جیسی سخت دفعات بھی لگائی گئیں تھیں بقیہ کارکن یا تو فرار تھے یا پھر نئے شہر کے گیسٹ ہاؤس اور ہوٹلوں میں رہنے پر مجبور تھے پولیس بھی برٹش طور طریقوں سے شیعوں کے مظاہرہ کو دبانا چاہتی تھی۔ قیادت کی کمی اور ایک دوسرے سے رابطہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے یہ مظاہرہ پچھلے مظاہروں کے مقابلے میں پھیکا رہا اور تقریباً سو لوگ اس مظاہرہ میں گرفتار ہوئے۔ اس پھیکے مظاہرے سے خوش ہو کر مایاوتی نے نئے پولیس کپتان اور ضلع مجسٹریٹ کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ادھر شیعوں میں اس بات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ تنظیم اور پلاننگ کی کمی نے اتنا اچھا موقع ہاتھ سے نکال دیا دوسرے دن ضلع انتظامیہ نے کرفیو ہٹا لیا اور حالات کے معمول پر آجانے کا اعلان کر دیا مگر ۵ جولائی کو لکھنؤ کی سب ہی ماتمی انجمنوں کے عہدیدار مولانا کلب جواد کے مکان پر یکجا ہوئے اور دوسری طرف درگاہ حضرت عباس میں بھی شیعوں نے ایک جلسہ بلا لیا۔ علی کانگریس کے صدر مرزا جاوید مرتضٰی کی صدارت میں تقریباً ایکسو بیس ماتمی تنظیموں کے صدر اور سکریٹری اس میٹنگ میں شریک ہوئے اور عہد کیا کہ وہ عزاداری کی تحریک کو اس طرح ناکام نہیں ہونے دینگے۔ اس میٹنگ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ایک نئے قسم کا مظاہرہ بھی شروع کیا جانا چاہئے اس کے تحت تمام شیعہ چھت پر چڑھ کر روزرات کو اجتماعی طور پر ماتم

کرینگے۔

میٹنگ کے خاتمے کے بعد مرزا جاوید مرتضٰی میرے بھائی جمیل شمسی کے ساتھ موٹر سائکل پر بیٹھ کر درگاہ حضرت عباس کے جلسے میں شامل ہونے کے لئے نکلے تو ان دونوں کو راستے میں ہی پولیس نے روک لیا جاوید مرتضٰی تو گرفتار ہو گئے مگر جمیل شمسی چپ چاپ تھانے سے کھسک لئے۔ جب جاوید مرتضی کی فتاری کی خبر درگاہ حضرت عباس پہنچی تو وہاں پر موجود ہزاروں شیعہ مشتعل ہو گئے اور احتجاجی جلوس نکال دیا جس کے بعد پولیس کیساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ عورتیں اور بچے بھی ماتم کرتے ہوئے باہر نکل آئے اس کے بعد پولیس نے لاٹھیاں برسا کر انگریزوں کے مظالم کی یاد تازہ کردی۔ اس کے بعد شہر بھر میں شیعوں اور پولیس کے درمیان جھڑپیں ہونے لگیں۔ پھر سے کرفیو لگ گیا۔ مگر رات کو لکھنؤ کی تاریخ میں پہلی بار ایک نئے قسم کا مظاہرہ ہوا تمام شہر کے شیعہ اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور یا حسین یا حسین کے نعرے لگانے لگے اس قسم کے انوکھے مظاہرے سے ضلع انتظامیہ حیراں رہ گیا ہر طرف ایک بھگدڑ کا عالم تھا خود پولیس والے گھبرائے ہوئے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ آدھے گھنٹے کے اس مظاہرے نے مایاوتی کے راج کی چولیں ہلادیں۔

۶ جولائی ۱۹۹۷ء کو سارے اخبار شیعوں کے مظاہرہ کی کامیابی کی خبروں سے بھرے پڑے تھے۔ شیعہ بھی مطمئن تھے کہ ان کے اتحاد اور یکجہتی نے تمام قوم کو رسوائی سے بچالیا اس تحریک کی خاص بات یہ تھی کہ پرانی شیعہ قیادت کو عوام نے کنارے لگا دیا تھا اور نوجوان علماء سرگرم نظر آرہے تھے ان میں مولانا ظہیر افتخاری اور یعصوب عباس وغیرہ بھی بہت آگے آگے تھے۔ یہاں پر ایک بات کہنا ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کا خیال ہے شیعہ سنّی فرقوں کو لڑوانے والے مختلف لیڈروں کی ضلع حکام نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ انھیں مالی امداد بھی فراہم کرتے ہیں۔ اگر یہ الزام سچ ہے تو بہت افسوسناک ہے کیونکہ برٹش عہد کے ضلع مجسٹریٹ یا دوسرے حکام اس طرح کی حرکتیں کرتے تو تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ تو یہاں آئے ہی تھے پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی اپنے ساتھ لیکر لیکن آزاد ہندوستان کے ایک شہر کے ضلع

حکام ایسا کریں تو شرم سے سر جھک جانا چاہئے۔ کیا ضلع حکام کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے دو گروہوں کے درمیان پھیلی ہوئی نفرت کو کم کریں؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شہر کے نظم و نسق سنبھالنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں مگر گزشتہ بیس برسوں میں کسی نے اس مسئلہ کو انسانی اقدار کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انسانوں کی جانوں کا اتلاف ہوتا رہا لیکن حکام نے اس کو ایک فلمی سین سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

۶ جولائی ۱۹۹۷ء کو دس بجے رات کو شیعوں نے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر اجتماعی طور پر پھر سے ماتم کیا تو پھر شہر میں ایک ہنگامی صورتحال پیدا ہو گئی۔ ۷ جولائی کو شیعوں نے کہا کہ وہ پرانے لکھنؤ کی گلیوں کو چھوڑ کر اپنی تحریک نئے شہر کی شاہراہوں پر لے جائیں گے تو پولیس نے زبردست ناکہ بندی کر دی مگر بہادر قوم کی بہادر عورتیں پولیس کو چکمہ دے کر حضرت گنج پہنچ گئیں۔ ایک گروہ شیش محل سے ڈی ایم کی کوٹھی کے سامنے پہنچا ان لوگوں نے ناؤ سے گومتی ندی پار کر کے یہ مظاہرہ کرنے کی ہمت کی تھی تو عورتوں کا دوسرا گروہ سبطین آباد کے امام باڑے (ہلواسیہ مارکیٹ کے سامنے) سے نکل آیا دوسری طرف سینکڑوں نوجوان کیپٹل سنیما کے پاس والی شاہی مسجد سے باہر نکل آئے یہ لوگ زنجیروں کا ماتم کر رہے تھے۔ اپنے ہی خون میں لہو لہان نوجوانوں کے ہونٹوں پر صرف یا حسین یا حسین کی صدائیں تھی اس پر اثر منظر کو دیکھ کر آس پاس کھڑے ہندو بھی یہ سوال کرتے دیکھے گئے کہ آخر اس مظلوم قوم کو اس کا حق کیوں نہیں دیا جا رہا ہے مگر پولیس کے جوان مایاوتی کے حکم پر ان نوجوانوں کو زور زبردستی سے گرفتار کر کے بسوں میں ٹھونس رہے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ساری دنیا سے آرہے احتجاجی خطوط، ہندوستان بھر سے آرہی مظاہروں کی خبریں اور پورے پردیش سے شیعوں کی جانب سے لکھنؤ کا گھیراؤ کئے جانے کا پروگرام یہ سب دباؤ کام آئے اور مولانا کلب جواد کو اسی دن بلا شرط رہا کرنے کا اعلان کر دیا گیا لیکن ڈی ایم کی کوٹھی کا گھیراؤ کرنے والی خواتین اپنی جگہ پر بیٹھی تھیں۔ مقدس چہروں والی یہ خواتین سیاہ برقوں میں اپنے جسم کو ڈھانکے صرف یا حسین یا حسین کے نعرے لگا رہی تھیں ان کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ میں ۲۰ سال پہلے جلوسوں پر لگی پابندی کا کرب صاف

نمایاں تھا حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم کی یہ کنیزیں لکھنؤ کی تاریخ میں پہلی بار اس طرح کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اور ان کے چہروں کا اعتماد کہتا تھا کہ وہ اپنا حق لے کر ہی رہینگی۔

مولانا کلب جواد کو رہا کئے جانے کا اعلان ڈی ایم نے کروایا تو ان عورتوں نے یقین نہیں کیا تب تھانہ چوک کے سرکل آفیسر گھر سے میری والدہ کے علاوہ میرے والد جناب شمس الحسن اور بھائی جمیل شمسی کو لیکر مظاہرین کے درمیان پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ ان لوگوں سے منتشر ہونے کی گزارش کریں کیونکہ مولانا کلب جواد صاحب رہا ہو چکے ہیں اور ایک خصوصی ہیلی کاپٹر ان کو لینے کے لئے للت پور جیل گیا ہوا ہے۔ جب میری والدہ نے عورتوں کو سمجھایا تو سب لوگ اپنی تحریک کی کامیابی پر مسرور اور مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں سپہر کو مولانا کلب جواد کو اموسی ہوائی اڈے سے جوشیلے شیعہ نوجوانوں کا ایک گروہ اپنے ساتھ لے کر نعرہ تکبیر اور نعرۂ حیدری کے فلک شگاف نعروں کے بیچ ان کے گھر تک لایا یہاں صرف شیعوں نے ہی نہیں سنّیوں نے بھی ان کا بڑی تعداد میں استقبال کیا۔

ادھر دہلی میں مولانا کلب صادق صاحب بھی بیرون ملک سے واپس آ چکے تھے ان کی قیادت میں ایک بہت بڑے مظاہرے کی تیاری چل رہی تھی اور سارے صوبے کے نمائندے ان سے برابر رابطہ قائم کر رہے تھے۔ وہ خود لکھنؤ جانا چاہتے تھے مگر ان کا وہاں جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ مایاوتی نے مولانا کلب صادق صاحب کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دئے تھے مگر مولانا لکھنؤ جانے پر بضد تھے ان کو گرفتاری کیا خوف ہو سکتا تھا؟ وہ تو ۱۹۶۹ء میں بھی اس سلسلے میں گرفتار ہو چکے تھے اور یہی نہیں ۱۹۶۹ء میں ۲۶ مئی کے فساد میں شیعہ سنّی فساد کے دوران انھوں نے پل غلام حسین کے ایک سنّی پیش امام کو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر بچایا بھی تھا اور پولیس کے وحشی جوانوں نے ان کو بری طرح زدو کوب بھی کیا تھا۔ مگر مولانا کے مداح چاہتے تھے کہ وہ گرفتار ہونے کے بجائے دہلی ہی سے تحریک چلائیں مگر مولانا کلب جواد صاحب کے رہا ہو جانے کے سبب مولانا کلب صادق صاحب اور کئی سنّی علماء کے اشتراک سے نکلنے والا مجوزہ مارچ ملتوی ہو گیا اور دہلی کے امامیہ ہال میں مولانا سید عبد اللہ بخاری کی صدارت میں ۱۱ جولائی کو ایک جلسۂ عام میں

کر حضرت علی کی افواج میں بغاوت ہوئی اور صلح کی گفتگو میں حضرت علی کے نمائندہ ابوموسیٰ عشری کو امیر معاویہ کے نمائندے کے دھوکہ دینے کی وجہ سے صورتحال پھر بگڑ گئی۔ حضرت علی کو خود اپنی ہی فوج کے ایک باغی ٹکڑے سے نہروان کے میدان میں جنگ کرنی پڑی۔ حضرت علی کی فوج سے بھاگے ہوئے اس ٹکڑے کو خارجی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان دونوں لڑائیوں نے اسلامی سلطنت کا شیرازہ منتشر کردیا اور اس کے دو حصہ ہو گئے ایک کی باگ ڈور تو حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ میں تھی جہاں قرآن وسنت کی روشنی میں حکومت چل رہی تھی اور دوسرا نظام امیر معاویہ کہ ہاتھوں میں تھا جہاں خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ حضرت علی گوکہ پیغمبر محمد کی جانشینی کے سب سے زیادہ حقدار تھے مگر انھوں نے تینوں خلافتوں کے زمانے میں تقریباً ۲۳ سال نہایت صبر و شکر کے ساتھ گزارے ان کا ایک بھی قدم ایسا نہ تھا جس سے مسلمانوں کے درمیان کسی خون خرابے کی نوبت آتی۔ مگر جب حضرت علی مسند نشین ہوئے تو کسی نے اس بات کا پاس نہ کیا کہ اسلام کا وہ پودا جس کے سرسبز وشاداب ہونے میں کافی عرصہ درکار تھا آپسی معرکہ آرائیوں کی شدید دھوپ سے جھلس جائے گا۔

حضرت علی اور حضرت ابو بکر میں کافی عرصہ تک تعلقات خراب رہے اور رسولؐ کی وفات اور باغ فدک کے معاملہ میں تقریباً چھ مہینے تک حضرت علی حضرت ابو بکر کے دربار میں نہیں گئے مگر بعد میں حضرت ابوبکر سے میل ملاپ ہو گیا حضرت ابو بکر کی وفات کے بعد آپ کی ایک زوجہ حضرت اسماء سے حضرت علی نے نکاح فرمایا اور حضرت ابو بکر کے بیٹے محمد بن ابو بکر کی پرورش کی۔

حضرت عمر سے بھی حضرت علی کے اچھے تعلقات رہے۔ یہاں تک کہ جب مسلمانوں نے ایران پر فتح حاصل کی تو حضرت عمر نے وہاں کی گرفتار شدہ شاہزادی حضرت شہر بانو کو امام حسینؑ کے عقد میں دیا۔ حضرت عمر حضرت علی کو اپنا محسن تسلیم کرتے تھے۔ اور بار بار کہا کرتے تھے اگر علی نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔

حضرت عثمان سے بھی حضرت علی کے اچھے تعلقات تھے ہر چند حضرت علی کو ان سے

تبدیل ہو گیا جس میں شیعہ سنّی افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

۱۴؍جولائی کو لکھنؤ میں مولانا کلب جواد صاحب کی تحریک کے آخری دور کا محدود جلوس نکلا کیونکہ مولانا کلب جواد اور ضلع انتظامیہ کے بیچ یہ معاہدہ ہوا تھا کہ سرکار تین مہینے کے اندر مسئلہ کا حل کر دے گی اور شیعہ اس بیچ کوئی بڑا مظاہرہ نہیں ہوا۔ ۱۵جولائی مطابق نوربیع الاول کو قاتلان امام حسین کے قتل کا جشن عید شجاع اس بار بڑی دھوم دھام سے منایا گیا در اصل یہ شیعوں کی تحریک کی کامیابی کا جشن بن گیا تھا۔ مگر شیعوں کو اصل کامیابی کا ابھی بھی انتظار تھا کیونکہ ان کا ہدف مولانا کلب جواد کی رہائی نہیں جلوس عزاء کی بحالی تھا۔

۲۰ برس کے بعد جلوس عزاء شاہراہوں پر

مایاوتی کے وعدے کے تین مہینے گزر گئے مگر وہ تو سب ہی کو علم تھا کہ یہ عورت مسئلہ کو حل نہیں کرے گی لیکن مولانا کلب جواد کے ساتھ ضلع انتظامیہ کا جو معاہدہ ہوا تھا اس میں شرط تھی کہ وزیر اعلی کے بدلنے سے معاہدہ پر کوئی فرق انہیں پڑے گا۔ مایاوتی کے بارے میں ہم لوگ جانتے تھے کہ وہ اپنے چھ مہینے گزر جانے کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کو دھوکہ ضرور دے گی اور وہی ہوا۔ ودھان سبھا میں جوتے چلے دھینگا مشتی ہوئی اور عوامی نمائندوں نے ایک دوسرے پر مائک اور کرسیاں پھینک کر ہندوستانی سیاست کی گرتی ہوئی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی بہر حال بھارتیہ جنتا پارٹی کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سرکار پر سیاسی دباؤ بہت زیادہ تھا ایسے میں شیعوں کا مسئلہ حل ہونے کی توقع کم تھی اس بیچ ۲۹ نومبر ۱۹۹۷ء کو کانگریس نے متحدہ محاذ کی سرکار سے (راجیو گاندھی قتل کیس میں جین کمیشن کی سفارشات کی بنیادوں پر) حمایت واپس لے لی اور ملک میں نئے انتخابات کی تیاری ہونے لگی۔

۱۹۹۸ء میں پہلی جنوری کو رمضان المبارک کے ساتھ نئے سال کا آغاز ہوا اور شیعہ بھی ایک نئے سرے سے اپنے حق کی بحالی کے لئے میدان میں آنے کی تیاری میں لگ گئے۔ لکھنؤ میں انتخابی مہم شروع ہو چکی تھا ادھر ۲۱ رمضان کو شیعوں نے حضرت علی کے یوم شہادت کے

سلسلے میں جلوس اٹھانے کا اعلان کر دیا لیکن لکھنؤ کی تاریخ میں پہلی بار ضلع انتظامیہ نے اس بارے میں سنجیدگی سے غور کیا اور ٹالنے والی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ اس طرف دہلی میں مولانا سید عبداللہ بخاری صاحب دوسرے علماء کے ساتھ مل کر ایک بار پھر لکھنؤ جانے کی تیاری میں تھے تاکہ وہاں جاکر ضلع انتظامیہ پر دباؤ ڈال سکیں اور ثابت کر سکیں کہ لکھنؤ کا شیعہ سنّی مسئلہ حقیقت میں شیعہ سنّی مسئلہ نہیں بلکہ مفاد پرست عناصر کا جنم دیا ہوا فتنہ ہے۔

۱۹ جنوری کو صبح مولانا لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے تو پھر پولیس نے ان کو ٹرین سے اتار کر غازی آباد میں گرفتار کر لیا مگر اس بار ان کی گرفتاری کو صیغۂ راز میں گیا کیونکہ ضلع انتظامیہ جلوس اٹھوانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ اس گرفتاری کی خبر سے لکھنؤ میں پھر تناؤ پیدا ہو سکتا تھا آخیر کار شیعہ سنّی لیڈروں کے درمیان مفاہمت ہو ہی گئی اور ضلع انتظامیہ کے سنجیدہ ہو جانے کے سبب تقریباً بیس برس بعد مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب کی یاد میں ایک شاندار جلوس پٹن صاحب کی کربلا سے اٹھ کر تالکٹورہ کی کربلا تک گیا جلوس میں ان تینوں شیعہ جوانوں کی تصویریں بھی شامل تھیں جنھوں نے اپنی قربانی کے ذریعہ جلوسوں کی بحالی کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ تقریباً ایک لاکھ شیعہ اس جلوس میں شامل تھے۔ سنّیوں کو بھی ایک جلوس کی اجازت ملی انھوں نے بھولا ناتھ کنویں سے چوپٹیاں تک جلوس نکالا شیعوں کے برعکس ان کے جلوس میں صرف دس پندرہ ہزار لوگ ہی شامل تھے جو اس بات کا غماز تھا کہ ان کی طرف سے صرف ضد بحث میں جلوس کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ ویسے بھی سنّیوں کی اکثریت مولانا عبدالعلیم فاروقی اور سنّی یوتھ فیڈریشن کے ساتھ نہیں ہے اور پرانے لکھنؤ کے دو تین محلوں کے علاوہ ان لوگوں کا کہیں کچھ اثر نہیں ہے۔ میری بات کی تصدیق عاشور کے دن بنگلہ بازار کی کربلا، ماہ نگر کی کربلا، ڈنڈیا بازار اور پھول کٹورہ کی کربلاؤں میں سنّیوں کی اس بھیڑ کو دیکھ کر کی جا سکتی ہے جو تعزیہ داری کے خلاف چل رہی مہم کے باوجود لاکھوں کی تعداد میں تعزیہ دفن کرنے آتی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں تو محرم کی نوے فیصد رونق سنّیوں کے ہی دم سے ہے اور کہیں کہیں تو شیعوں کا ایک گھر بھی نہیں ہے لیکن محرم اسی شان و شوکت کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے

اختتامی کلمات

قارئین و آپ کو کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا ہو گا کہ شیعہ سنّی مسئلہ کتنا مذہبی ہے اور کتنا سیاسی؟ کس طرح سیاسی عناصر درباری ملاؤں اور مصلحت پسند عناصر نے مسلکی اختلافات کو ہوا دے کر ان کو فساد میں تبدیل کروایا۔ اس طرح کے جھگڑے کروانے والوں نے اسلام کی کتنی خدمت کی یہ تو وہی جانتے ہوں گے ہاں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ لکھنؤ کے شیعہ سنّی فسادات سے تنگ آکر یا گھربار لٹنے کے بعد کئی لوگوں نے اسلام ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ میں ذاتی طور پر کم سے کم ایسے دو لوگوں سے واقف ہوں جو پہلے اطہر مہدی اور اکھن پہلوان تھے بعد میں وہ اشوک مسیح اور اجیت سنگھ ہو گئے۔ جو لوگ شیعہ سنّی فرقوں کو آپس میں لڑوانے میں پیش پیش رہتے تھے وہ اس وقت اچانک سین سے غائب ہو جاتے ہیں جب اسلام پر کوئی وقت آتا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے وقت مولانا عبدالعلیم فاروقی اپنے مدرسہ کے کسی کونے میں چھپے بیٹھے تھے اور سنّی یوتھ فیڈریشن کے لوگ اکبری گیٹ کی کسی بلڈنگ میں منھ چھپائے تھے مگر علی کانگریس جیسی تنظیمیں نہ صرف میدان عمل میں سرگرم تھیں بلکہ فرقہ پرست طاقتوں کا عملی طور پر مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو آمادہ کر رہی تھیں۔

تادم تحریر ملک میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا راج ہے اور صوبے میں بھی اسی کی حکومت ہے اور محرم میں چند روز باقی ہیں۔ اکیس رمضان کا جو جلوس اٹھا تھا وہ ایک وقتی سمجھوتہ کے تحت اٹھا تھا اب نئی سرکار بھی منھ بھرائی اور خوشنودی کی پالیسی اختیار کرتی ہے یا ملک کے قانون و آئین کے مطابق اقلیت در اقلیت اس کے مذہبی فرقہ کو اس کے حقوق دیتی ہے یا نہیں۔؟

ضلع انتظامیہ، حکومت اور سیاسی پارٹیاں اس مسئلہ کا جو بھی حل نکالیں وہ اپنی جگہ لیکن اصلی حل وہی ہو گا جو مسلمان، قرآن ۔۔، سنّتِ رسول اور اہلبیت اطہار کے اسوہ کی روشنی میں مل جل کر نکالیں گے اللہ سے دعا ہے کہ وہ مسلمان لیڈر شپ کو ۔ پسی اختلاف سے بلند ہو کر خوف خداوندی کے سائے میں شیعہ سنّی مسئلہ حل کرنے کی سعادت نصیب کرے۔ (آمین)

کئی مسائل میں اختلاف تھا مگر یہ اختلاف بالکل اسلامی اقدار پر منحصر تھا ذاتی پر خاش پر نہیں۔ یہاں تک کہ حضرت علی نے باغیوں کے درمیان گھرے ہوئے حضرت عثمان کے لئے آب ودانہ کا انتظام اپنے بیٹوں کے ذمہ کیا۔

مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جب حضرت علی خلیفہ ہوئے تو بہت سے لوگوں کے گلے سے یہ خلافت نیچے نہیں اتری۔ اور حضرت علی کے خلاف ہوئی محاذ آرائی شروع کردی جس کے سبب مسلمان چار حصوں میں بٹ گئے۔ پہلا فرقہ تو شعییان علی کا تھا جو حضرت علی کو مکمل طور پر حق بجانب اور ان کے ہر حکم کا خود کو پابند سمجھتا تھا۔ دوسرا فرقہ دوستان امیر معاویہ کا تھا جس کی نظر میں امیر معاویہ کا ہر اقدام درست تھا۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جس کی نظر میں حضرت علی بھی اپنی جگہ پر حق پر تھے اور امیر معاویہ سے خطائے اجتہادی سرزد ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ چوتھا فرقہ خوارج کا تھا جو حضرت علی اور امیر معاویہ دونوں کو ہی اسلام میں فساد پھیلانے کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اسی فرقہ کے ایک رکن عبدالرحمٰن بن ملجم نے ۲۱ رمضان ۴۰ھ مطابق ۲۰ جنوری ۶۶۱ء کو کوفے کی مسجد میں حضرت علی کے سر پر اس وقت تلوار کا زخم لگایا جب کہ وہ روزہ کہ عالم میں فجر کی نماز کی امامت کر رہے تھے۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے حضرت حسن کو خلیفہء وقت بنایا گیا مگر انھیں چھ مہینے کے اندر ہی خلافت کے عہدہ سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ بالآخر امیر معاویہ کو کامیابی مل گئی اور وہ حکومت کے سربراہ بننے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

مگر یہ سربراہی امیر معاویہ اور حضرت امام حسن کے درمیان ہوئے صلح نامہ کی شرائط کے بموجب ہی امیر معاویہ کو ملی تھی۔ ۲۶ جولائی ۶۶۱ء کو امام حسن اور امیر معاویہ کے درمیان جو صلح نامہ تحریر کیا گیا اس کی کچھ اہم شرائط اس طرح تھیں

۱۔ معاویہ حکومت کے نظام میں کتاب خدا اور سنت رسول اور صحیح راستے پر چلنے والے خلفاء کے طریقے پر عمل کرینگے۔

۲۔ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا

۳۔ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لئے امان ہوگی۔

۴۔ حضرت علی کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں گے ان کے جان و مال و ناموس اور اولاد محفوظ رہیں گے۔

۵۔ معاویہ، حسن بن علی اور ان کے بھائی حسین اور خاندان رسول میں کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہ کرینگے نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ اعلانیہ طریقہ پر اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا' ڈرایا اور دہشت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا

مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ امیر معاویہ کی طرف سے صلح نامہ کی سب ہی شرائط کا کھلم کھلا مذاق اڑایا گیا خلافت کو بادشاہت میں بدل دیا گیا۔ حضرت علی کے کئی معزز دوستوں اور چاہنے والوں کو سزایاب کیا گیا۔ منبروں سے حضرت علی پر سب و شتم کرنے کی شروعات کی گئی۔ امام حسن کو بنت اشعث کی معرفت زہر دغا سے شہید کروادیا یزید کو اپنا جانشین نامزد کر دیا اور امام حسین کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش بھی کی گئی۔

طبری جلد ۶ صفحہ ۱۸۶ پر امیر معاویہ کے بارے میں تحریر ہے۔ امیر معاویہ کے لئے ان کی زندگی کا طویل دور کم نہ تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کی قسمت کے مالک بن کر اپنے حوصلے نکال لئے تھے اور دنیا کی جاہ و حشمت اور مال و دولت کے خوب خوب مزے اٹھا چکے تھے جس کا اعتراف ایک خاص انداز میں انھوں نے خود بھی کہا اور فرمایا "خدا کی رحمت ہو ابو بکر پر انھوں نے نہ دنیا کو چاہا اور نہ دنیا ان کی طرف متوجہ ہوئی اور حضرت عمر ان کی طرف دنیا آئی مگر وہ دنیا کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور حضرت عثمان انھوں نے دنیا میں سے کچھ حصہ لیا اور دنیا نے ان سے کچھ حاصل کیا لیکن ہم ! ہم تو دنیا میں غلطاں ہو گئے اور لوٹ لوٹ کے اس میں رہے"

جو کچھ بھی ہو امیر معاویہ کے طرز زندگی کی سبب ان کو خلافت راشدہ کے سلسلہ سے جوڑا نہیں جا سکا۔ یہاں تک کہ امام حسن کے چھ مہینے کے دور حکومت کو تو خلافت راشدہ کا جزو مسلمان تسلیم کرتے ہیں لیکن امیر معاویہ کو خلافت راشدہ میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل نہ ہو سکا۔

مئی ۶۸۰ء میں امیر معاویہ کے مرنے کے بعد ان کی آخری خواہش کے مطابق ان کے بیٹے یزید کو خلیفہ وقت بنایا گیا اس سے قبل کہ ہم اور آگے گفتگو کریں آئے یزید کے بارے میں کچھ نامور علماء کی رائے جان لیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں "یزید ایسا شخص تھا جو اپنے باپ کی تصرف کردہ کنیزوں (اپنی سوتیلی ماؤں) بیٹیوں اور بہنوں تک کو اپنے لئے حلال سمجھتا تھا شراب پیتا اور نماز ترک کرتا تھا۔"

صواعق محرقہ ۱۲۰ھ (مطبوعہ مصر) میں تحریر ہے کہ عبداللہ بن حنظلہ کا کہنا ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کی حکومت میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب آسمان سے ہم پر تیر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں و بہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا۔"

علامہ ابن اثیر نے کہا ہے کہ مدینہ کے مغزز افراد پر مشتمل ایک گروہ جب یزید سے مل کر مدینہ واپس آیا تو یہ گروہ یزید کے فسق و فجود کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکا ہر چند یزید نے ان لوگوں کو کثیر رقومات دے کر واپس کیا تھا۔ مندر بن زبیر نے واپسی کے بعد تقریر میں کہا کہ یزید نے مجھ کو ایک لاکھ درہم دئے ہیں مگر یہ چیز اس بات سے مجھے مانع نہیں ہو سکتی کہ میں اس کے حالات آپ لوگوں کے سامنے پیش نہ کروں وہ شراب پیتا ہے مست ایسا ہوتا ہے کہ نماز ترک کر دیتا ہے۔ ہم ایک ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں جس کا کوئی مذہب نہیں وہ شراب پیتا ہے اور طنبورہ بجاتا ہے اور گانے والیوں سے گانے سنتا رہتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔

عیسائی مورخ ایڈورڈ براؤن نے ہسٹری آف پرشیا میں صفحہ ۳۲۶ پر لکھا ہے "یزید ایک بدوماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا، صحرا کی کھلی ہوا میں اس نے پرورش پائی، شکار کا ماہر ایک بلیغ شاعر اور عاشق جانباز، شراب اور دیگر لہو لعب کی باتوں کا شیدا اور رقص و سرود کا دلدادہ، مذہب سے کوسوں دور تھا۔

۲۶ جولائی ۶۶۱ء میں امیر معاویہ نے امام حسن سے جو صلح کی تھی اس کے تحت امیر معاویہ کے مرنے کے بعد عنان حکومت امام حسین کو ملنی تھی مگر صلح نامہ کی شرائط کو بھلاتے

ہوئے امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو مسند نشین کرنے کا اعلان کر دیا اور اپنی ہی زندگی میں یزید کے لئے بیعت حاصل کرنے کی مہم شروع کر دی یزید کی اوباشی اور غیر اسلامی روشوں کے سبب دیندار اور پاکباز مسلمان اس کو اپنا حکمراں ماننے پر تیار نہیں تھے ان میں امّ المومنین حضرت عائشہ‘ حضرت عبد اللہ بن زبیر‘ عبد الرحمن بن ابی بکر حضرت عبد اللہ ابن عمر‘ حضرت عبد اللہ ابن عباس جیسے سر کردہ افراد بھی شامل تھے۔ خاندان بنوہاشم کی سب سے اہم اور محترم شخصیت امام حسین اور ان کے عزیزوں اور رشتے داروں کی جماعت بیعت نہ کرنے کے معاملے میں پیش پیش تھی ہی۔ کچھ عرب سردار بھی مخالف تھے ان میں عبد الرحمان بن خالد ابن ولید اور سعید بن عثمان کے نام قابل ذکر ہیں لیکن عبد الرحمان کو دوا میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور سعید بن عثمان کو خراسان کی گورنری دیکر ٹھنڈا کر لیا گیا۔

۲۴ مئی ۶۸۰ء مطابق ۲۲ رجب سنہ ۶۰ء کو امیر معاویہ کے مرنے کے بعد یزید تخت نشین ہوا تو اس نے مدینے کے گورنر کے پاس احکامات بھیجے کے امام حسین سے بیعت طلب کی جائے امام حسین نے بیعت کرنے کے بجائے مدینہ کو چھوڑنا مناسب سمجھا وہ اپنے اصحاب و انصار کے ساتھ ۲۸ رجب سنہ ۶۰ مطابق ۳۰ مئی ۶۸۰ء کو مدینہ سے روانہ ہو گئے اور پھر مکہ کے مقدس شہر میں حرم کے نزدیک قیام کیا۔ لیکن وہاں بھی ان کو پر امن زندگی گزارنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ادھر کوفے میں یزید کے تخت نشین ہونے کے بعد بہت بے چینی تھی اور وہاں کے لوگ چاہتے تھے کہ حضرت امام حسین وہاں آکر ایک اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالیں اور انقلاب کی شروعات کریں امام حسین نے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو کوفے کے حالات جاننے کے لئے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔

اس بیچ حج کا زمانہ قریب آیا تو امام حسین کو خبر ملی کہ یزید کے کچھ فوجی حاجیوں کے بھیس میں خانہ کعبہ میں پہنچنے والے ہیں اور وہاں فساد پھیلا کر کہ امام حسین کو قتل کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ جب امام حسین کو ایسی اطلاع ملی تو وہ حج سے قبل ۷ ستمبر ۶۸۰ء مطابق ۸ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ کو مکہ سے روانہ ہو گئے تاکہ خانہ کعبہ کی بے حرمتی نہ ہونے پائے اور وہاں کشت و خون نہ ہو۔

معرکۂ کرب وبلا

امام حسین اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کے ساتھ صحراؤں کے مصائب برداشت کرتے ہوئے دو محرم الحرام ۶۱ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۶۸۰ء کو عراق کے ایک ویران مقام کربلا پہنچے جہاں انھوں نے فرات کے نزدیک اپنے خیمے نصب کئے۔ یہیں ان کو خبر ملی کہ ۹ ذی الحجہ ۶۰ھ مطابق ۸ ستمبر ۶۸۰ء کو) ان کے بھائی حضرت مسلم بن عقیل کوفے میں یزید کے گورنر ابن زیاد کے حکم پر بہت بیدردی کے ساتھ دونوں بچوں سمیت شہید کر دیا گیا اور نہایت وحشیانہ طریقے سے حضرت مسلم کی لاش کو کوفے کی گلیوں میں رسّی باندھ کر کھینچا گیا۔ ساتھ میں ہزاروں شیعوں کو مختلف جیلوں میں قید کر لیا گیا اور کئی خاندانوں پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے۔ امام حسین نے ابھی خیمے نسصب ہی کئے تھے کہ یزید کی فوج کا پہلا دستہ حر بن یزید ریاحی کی قیادت میں پہنچ گیا اور اس نے خیموں کو فرات کے کنارے سے ہٹانے کے احکامات دئے اس وقت ہی خونیں تصادم کی نوبت آگئی تھی لیکن حضرت امام حسین نے اپنے عزیزوں اور اصحاب کے غصّہ کو ٹھنڈا کیا اور خیمے فرات سے دور کر لئے۔

یزید کی طرف سے فوجی دستے آتے رہے۔ یہاں تک کہ سات محرم کو اس کی تعداد تیس ہزار سے تجاوز کر گئی امام حسین کے ساتھ کل ملا کر ستر دوست اور عزیز تھے جبکہ یزید کی جانب سے بھیجی گئی فوجیں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ سات محرم ۶۱ھ یزید کی فوجوں نے فرات پر قبضہ کرلیا اور امام حسین پر پانی بند کر دیا۔

نو محرم کو یزید کی فوجوں نے اچانک حملہ کر دیا لیکن امام حسین نے ایک رات کی مہلت مانگی رات بھر امام حسین کے ساتھیوں نے عبادت وریاضت میں بسر کی شہید مرتضٰی مطہری اپنی کتاب تحریفات واقعۂ کربلا میں تحریر فرماتے ہیں کہ یزید کی فوج کے تقریباً تیس سپاہی رات کے اندھیرے میں خیام حسینی کے پاس ٹوہ لینے کے لئے آئے تو انھوں نے امام حسین اور ان کے ساتھیوں کو نمازوں میں مشغول دیکھا اور ان کی پر اثر تکبیروں سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہ بھی لشکر

حسینی میں شامل ہو گئے اسی لئے بعض روایتوں میں امام حسین کے ساتھیوں کی تعداد ۱۰۳ بھی درج ہے جبکہ حضرت حر بن ریاحی اور ان کے بیٹے نے عاشور کی صبح کو لشکر حسینی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ زیادہ تر روایتوں میں امام حسین کے ۷۲ ساتھیوں کا ہی ذکر ہے لیکن کہیں کہیں شہیدان کربلا مین ۱۰۳ نام ہونے کی وجہ سے لگتا ہے کہ معرکۂ کرب وبلا سے قبل یزید کی افواج کے چند سپاہی امام حسین کی مظلومی دیکھ کر ان کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

عاشور یعنی ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کا سورج نمودار ہوا تو جبین وقت پر پیاسوں نے اپنی کامیابی کی ایسی داستان تحریر کی جو چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اسی طرح چمک رہی ہے جیسے کہ کل کی بات ہو۔

امام حسین کے بیٹے بھتیجے بھائی، ناصر، مددگار، بچپن کے دوست سب اس معرکہ آرائی میں جام شہادت نوش کر چکے تو امام حسین نے اپنے چھ مہینے کے بیٹے حضرت علی اصغر کی قربانی دیکر دین محمدی کو یزید کے حملے سے بچایا اور پھر میدان جنگ میں ہزار زخم کھا کر جب زمین گرم پر سجدہ آخر ادا کیا تو اپنے اس اللہ کا شکر ادا کیا جس نے انھیں اس امتحان سے گزرنے کا حوصلہ عطا کیا تھا۔

شہادت امام حسین کے بعد بھی یزیدی فوجوں کی انتقامی کاروائی ختم نہیں ہوئی امام حسین کے خیام میں آگ لگائی گئی ان کی مقدس بہنوں بیٹیوں اور ازواج مطہرات کو قید کیا گیا پاک بازوؤں میں رسّی باندھ کر انھیں قید و بند کی صعوتبوں سے گزارا گیا۔ پیغمبر حضرت محمدؐ کی ہجرت کے صرف ساٹھ سال بعد ان کی امت نے ان کے خاندان کو کتنا بڑا تحفہ دیا تھا؟ چہیتی نواسی زینب وام کلثوم کے ہاتھوں میں رسّیاں فاطمہ زہرا کی کنیز فضہ کی گرفتاری، امام حسین کے بیمار بیٹے علی ابن الحسین زین العابدین کے گلے میں طوق خاردار حضرت علی کی گھر کی بہو بیٹیوں کو کوفہ وشام کی بازاروں میں بے پردہ گھما کر دربار یزید میں پیش کیا جانا۔ . . . . لیکن کیا خاندان رسالت کے افتخار میں اس سے بال برابر بھی فرق آیا؟ کیا یزید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذلیل وخوار نہیں ہوا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یزید کو اس طرح نیست ونابود نہیں کیا کہ آج اس کی قبر کا پتہ بھی نہیں؟ کیا محرم

کے دنوں میں دنیا کے طول و عرض میں اٹھنے والے ماتمی جلوس حسین کی فتح و یزید شکست کا اعلان نہیں کر رہے ہیں؟

امام حسینؑ کی شہادت کے اثرات

امام حسین کی شہادت کے بعد ان کے اہلبیت کو یزید نے کچھ دنوں تک زندان میں رکھا اور بعد میں اسے لگا کہ مسلمانوں میں اس معاملہ کو لیکر بے چینی پھیل رہی ہے تو اس نے ان لوگوں کو رہا کر دیا اور مدینہ واپس جانے کی اجازت دے دی ساتھ ہی یزید کی پروپگنڈہ مشینری اس کام میں لگ گئی کہ قتل امام حسین اس کی مرضی سے نہیں ہوا بلکہ ابن زیاد اور عمر سعد نے اس کی اجازت کے بغیر امام حسین کو قتل کر دیا لیکن یہ سب کچھ اتنے بڑے پیمانے پر کہے جانے کے بعد لوگوں کے حلق سے نہیں اترا اور جب امام حسین کے کنبہ کے بقیہ افراد واپس مدینہ منورہ پہنچے اور بنو ہاشم کے محلّہ میں عورتوں نے آنا شروع کیا تو حضرت زینب اور حضرت کلثوم کی زبانی انھیں پورے حقائق کی خبریں موصول ہوئیں۔ خود امام زین العابدین واقعہ کے چشم دید گواہ تھے اور ان کی گریہ وزاری اور عبادت و ریاضت کا اتنا اثر مدینہ کے لوگوں پر ہوا کہ مدینہ کے لوگوں نے تو یزید کی بیعت کا طوق ملامت ہی اتار کر پھینک دیا مکہ میں بھی عبداللہ بن زبیر نے پرچم انقلاب بلند کر دیا اور خون حسین کا انتقام لینے کا اعلان کیا اور یزید کی طاقت ور حکومت کے سامنے چیلنج بن کر کھڑے ہو گئے انھوں نے نو سال تک مکہ مکرمہ پر خود مختارانہ حیثیت سے حکومت کی مگر حکومت پانے کے بعد اپنے نصب العین کو بھول گئے۔

امام حسین کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں ایک خلفشار پیدا ہو گیا۔ خود کوفے والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور لوگوں نے اپنی بزدلی پر لعنت ملامت کی اور توبہ و استغفار کے بعد خون حسین کا انتقام لینے کی قسم کھائی سلمان بن صرو خزاعی کی قیادت میں توابین کی ایک جماعت قائم ہو گئی۔

ان لوگوں نے طے کیا کہ قتل امام حسین کا اصل سبب حکومت دمشق (یزید کی

راجدھانی) ہے اس لئے ہم کو سیدھے یزید سے ہی مقابلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل یہ اسلامی لشکر شام کے لئے روانہ ہوا اور مقام عین الورہ پر اس کا سامنا یزید کی فوجوں سے ہوا مگر کم تعداد کے سبب ان لوگوں کو کامیابی نہیں ملی اس جہاد میں سلیمان بن صرو خزاعی 'مسیّب ابن نجبہ اور عبداللہ ابن وال سمیت ہزاروں توابین یا تو شہید ہوئے یا زخمی ہوئے اور آخیر کار ان لوگوں کو لوٹنا پڑا۔

جہاد مختار :۔ قتل امام حسین کے وقت مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی جیل میں تھے بعد میں ان کو عبداللہ بن عمر کی سفارش پر قید سے رہائی مل گئی۔ اس انقلابی مرد نے حضرت مالک اشتر کے بیٹے ابراہیم کے تعاون سے خون حسین کا انتقام لینے کا بیڑہ اٹھایا مگر اس وقت تک یزید واصل جہنم ہو چکا تھا۔ یزید کو شکار کا بہت شوق تھا کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دن جنگل میں شکار کھیلنے گیا تو وہیں درندوں نے اس کو پھاڑ کھایا اور اس کی بچی کھچی لاش کو گدھ اور چیل کوے نوچتے رہے یزید کل تین سال چھ مہینے حکومت کر سکا اپنی حکومت کے پہلے سال میں اس نے حسین ابن علی کو قتل کیا دوسرے سال اس نے مدینہ منورہ پر ۶۸۳ء میں چڑھائی کی اور اسّی جلیل القدر اصحاب رسول اور ۷۰۰ حفاظ قرآن مجید اس حملہ میں شہید کر دیے گئے اور تیسرے سال خود خانہ خدا پر فوج کشی کی تاکہ عبداللہ بن زبیر کو شکست دی جا سکے۔ یزید کی موت کے بعد جب یزید کے بیٹے معاویہ بن یزید کو تخت نشینی کے لئے دربار میں لایا گیا تو منبر پر جا کر اس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بنی ہاشم کا قصیدہ پڑھا۔

"ایہا الناس۔ یہ خلافت اللہ کی مستحکم رسّی ہے میرے دادا معاویہ نے اس معاملہ میں خلافت کے اصلی حقدار حضرت علی ابن ابی طالب سے جھگڑا کیا اور وہ افعال اختیار کئے جو آپ سب کو معلوم ہیں۔ پھر یہ منصب میرے والد (یزید) کو پہنچا اور وہ بھی اس کے مستحق نہ تھے انھوں نے نواسۂ رسول سے جنگ کی اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی عمر ختم ہو گئی اور وہ بھی اپنی قبر میں اپنے گناہوں کی قید میں پہنچ گئے"..... اس کے بعد یزید کا بیٹا رونے لگا اور کہا "سب سے

بڑی مصیبت ہمارے لئے اس امر کا احساس ہے کہ ان کا انجام برا ہوا ہے انھو نے اولاد رسول کو شہید کیا اور شراب کو مباح کر دیا اور کعبہ کو برباد کیا.... اور میں نے اب تک خلافت کی مٹھاس نہیں چکھی تو اس کی تلخی کیوں برداشت کروں؟ تم جانو اور تمہارا کام مجھے خلافت سے کوئی سرکار نہیں ہے۔ دنیا اگر اچھی نعمت ہے تو اب تک اس سے ہم بہت کافی حصہ لے چکے اور اگر وہ بری چیز ہے تو جتنا اب تک ہم اس سے لیتے رہے وہی بہت کافی ہے" اسی کے بعد معاویہ بن یزید اپنے گھر کے اندر چلا گیا اور چالیس دن کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا (صواعق محرقہ ۱۳۴)

معاویہ بن یزید کے اس انکار کے باوجود عنان حکومت بنوامیہ کے ہاتھ میں ہی رہی اور مروان بن حکم کو تخت نشین ہونے کا موقع مل گیا۔ ادھر عبداللہ بن زبیر کا اقتدار مکہ سے بڑھ کر عراق تک پہنچ چکا تھا اور کوفہ بھی عبداللہ بن زبیر کے قبضہ میں تھا جہاں عبداللہ بن مطیع گورنر کے فرائض انجام دے رہے تھے مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کا صرف ایک مقصد تھا قاتلان حسین سے انتقام لینا لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک کہ وہ کوفے میں ایک خود مختار حکومت قائم نہ کر لیتے اس وجہ سے ان کا ٹکراؤ عبداللہ بن مطیع کی فوجوں سے ہوا اور مطیع کو کوفہ چھوڑ کر جانا پڑا مختار کو کوفہ میں تسلط حاصل ہو گیا۔ لیکن حکومت پانے کے بعد امیر مختار نے نصب العین کو فراموش نہیں کیا اور چن چن کر قاتلان حسین کو قتل کرنا شروع کیا علامہ ابن حجر مکی نے ان لوگوں کی تعداد چھ ہزار بتائی ہے جنھیں امیر مختار کی فوجوں نے قتل امام حسین کے الزام میں گرفتار کیا تھا اس میں عمر سعد، شمر، سنان، خولی اور حرملہ وغیرہ شامل تھے۔ (صواعق محرقہ ۱۱۸)

ابن زیاد یزید کی ہلاکت کے بعد بصرہ فرار ہو چکا تھا اس کو شام سے دوبارہ بھیجا گیا تا کہ ۳۰ ہزار کی فوج لے کر امیر مختار پر یلغار کر سکے۔

امیر مختار نے ابراہیم بن مالک اشتر کو چند ہزار کی فوج کے ساتھ ابن زیاد کے مقابلے کے لئے بھیجا فرات کے کنارے جنگ ہوئی جس میں ابن زیاد کو شکست ہوئی علامہ حجر مکی کا بیان ہے کہ ۶۵ھ میں عاشور کا ہی دن تھا جب ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں کے سر قلم کر کے ابراہیم بن مالک اشتر نے امیر مختار کے پاس بھیجے۔

مختار کو بیک وقت دو دو حکومتوں سے ٹکرانا پڑا اور اس وجہ سے وہ ہمیشہ لڑائیوں میں
گھرے رہے آخر کار مکہ سے عبداللہ بن زبیر کے حکم سے ان کے چھوٹے بھائی کی قیادت میں ایک
بہت بڑی فوج امیر مختار کی چھوٹی سی ریاست پر ٹوٹ پڑی اور امیر مختار کی مہم کا خاتمہ کر دیا لیکن اس
وقت تک اکثر قاتلان حسین کو امیر مختار جہنم واصل کر چکے تھے۔
بعد میں امام حسین کے پوتے حضرت زید بن علی نے بھی بنوامیہ کی طاقت ور حکومت سے لوہا لیا
لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دئے گئے۔

حضرت زید کا جہاد اس سلسلے کا آخری جہاد مانا جا سکتا ہے لیکن اُن کے جہاد کے بعد ان
کے بھتیجے حضرت امام جعفر صادق کو ایک اموی خلیفہ عمر بن العزیز نے کچھ پر سکون لمحات ضرور
دئے تا کہ وہ اسلام کے شجر کی آبیاری اطمینان کے ساتھ کر سکیں۔

بنوامیہ کے طرز حکومت کے سبب اسلام دو ایسے حصوں میں بٹ گیا جس میں دین ایک
طرف اور دنیا دوسری طرف تھی دین کی حفاظت کی ذمہ داری اہلبیت پاک کے کاندھوں پر تھی
تو دنیا کے مزہ لوٹنے میں لگے تھے۔

مسلم حکمراں امیہ کے کچھ حاکم تو ایسے بھی گزرے جنھوں نے مسلمانوں تک جزیہ
وصول کیا۔ دنیا کی لوٹ کھسوٹ اور عام انسانوں کی گاڑھی کمائی پر غاصبانہ قبضہ جمانے اور عیش و
عشرت کی زندگی گزارنے کی غیر اسلامی روش کے سبب مسلمانوں کے مابین کشت و خون کا بازار
گرم رہا اور عام مسلمانوں کو چین نصیب نہ ہوا جس سے تبلیغ اسلام میں بھی دشواری پیش آئی مگر
جنگ و جدال سے دور مسلمانوں کا امن پرور گروہ دنیا کے دوسرے خطوں میں اسلام کے شجر سایہ
دار کا گھنیرا سایہ اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھتا رہا اور لوگ اسلام کے دامن میں سماتے گئے۔

پہلی شیعہ حکومت:

عرب کی سرزمین سے دور مراقش میں امام حسن کے پرپوتے حضرت ادریسؒ کو سن
۷۸۹ء میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا موقع ملا انھوں نے اسلام کی تعلیمات اور سیرت رسولؐ

کی پیروی کرتے ہوئے وہاں کی رعایا کا دل رحم دلی اور محبت کی معرفت جیتا۔ ان کی انسان نوازی غرباء پروری اور رحم دلی کے سبب وہ قبیلے بھی مسلمان ہونے لگے جو مسلمانوں کے زیر اقتدار آجانے کے بعد بھی اسلام قبول نہیں کررہے تھے۔ یہی نہیں حضرت ادریسؒ نے بربری طبقہ کا دل بھی جیت لیا اور وہ بھی مشرف بہ اسلام ہوئے بعد میں بربر کے لوگوں نے اسلام کے فروغ میں جو رول ادا کیا وہ سب جانتے ہیں۔

حضرت ادریسؒ کے خاندان نے تقریباً دو سو برس تک مراقش پر حکومت کر کے اسلام کی جڑوں کو مضبوط کیا۔

ایران میں شیعیت کا عروج

ایران کو خلیفہ دوئم حضرت عمر کی فوجوں نے فتح کیا اور اس کے بعد وہاں رفتہ رفتہ اسلام کا نور پھیلنے لگا۔ ایران کے مفتوح بادشاہ یزدجرد کی بیٹی حضرت شہر بانو کو حضرت عمر نے حضرت علی کے صاحبزادہ حضرت امام حسین کے عقد میں دے دیا۔ ایران کے عوام کے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا کیوں کہ پیغمبر حضرت محمد کے چہیتے نواسے کے ساتھ ان کے ملک کی ایک دختر کا رشتہ جوڑ دیا گیا تھا۔ اور پھر ان ہی کہ بطن مبارک سے امام علی ابن الحسین یعنی امام زین العابدین کی ولادت ہوئی۔ اور کربلا کے واقعہ کے بعد سلسلۂ امامت بھی امام زین العابدین سے ہی چلا اس سے ایران والوں میں خانوادۂ رسالت کا احترام روز بروز بڑھتا گیا۔ اور وہ رفتہ رفتہ شیعیت کی طرف مائل ہوتے گئے۔

علاقہ ءغور میں آکر بسنے والے ضحاک جیسے ظالم و جابر کی نسل کے ایک بادشاہ شنسب نے سب سے قبل حضرت علی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور شنبی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ حضرت علی نے بادشاہ کو ایک عہد نامہ اور پرچم بھی سونپا تھا اس کے بعد شنسی حکمرانوں کے یہاں ایک رسم ہوگئی کہ جو بھی عنان حکومت سنبھالتا وہ حضرت علی کے عطا کردہ پرچم کو ہاتھ میں لے کر عہد نامہ پر عمل پیرا ہونے کی قسم کھاتا۔ (اس عہد نامہ میں اسلامی اصولوں پر عمل درآمد'

ظلم وجور نہ کرنے اور عوام سے بہتر سلوک کرنے جیسی باتیں تھیں۔)

"رفتہ رفتہ عراق سے لیکر غور تک پھیلی ہوئی زمین پر حضرت علی سے محبت رکھنے والے شیعوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ غور کے حکمرانوں کو تو حضرت علی کی نسل کے اماموں سے اتنا لگاؤ تھا کے انھوں نے امیہ خلافت کو تسلیم کرنا ہی بند کر دیا تھا (منہاج)

امام حضرت صادق (جو شیعہ فرقہ کے امام ششم کہے جاتے ہیں) مسلمانوں کے سب ہی فرقوں میں بہت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان ہی کے زمانے میں اسلامی فقہہ اصول فلسفہ اور قرآنی احکامات کی تفاسیر کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ امام صادق اپنے آپ میں ایک یونی ورسٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سے استفادہ کرنے والے لاتعداد لوگ تھے مگر ان ہی میں سے چار ایسے جید عالم تھے جنھوں نے چار الگ الگ مکاتیب فکر کی بنیاد ڈالی۔ یعنی امام ہنبلؒ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور امام مالک۔ امام کے ان ہی چار شاگردوں سے نسبت کی وجہ سے سنّی فرقہ کے چار اسکول ہیں جنھیں ہنبلی، شافعی، حنفی، اور مالکی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ خود امام جعفر صادق کی پیروی کرنے والا ایک اور گروہ تھا اور اس کو جعفری کہہ کر یاد کیا جاتا لیکن یہ فرقہ اپنے آپ کو شیعیان علی کے نام سے ہی پکارا جانا پسند کرتا ہے۔

امام جعفر کے زمانے میں اموی خلافت کے حکمراں عمر بن عبد العزیز کا رویہ کافی حد تک معتدل تھا۔ اور حاکم کی طبیعت میں تھوڑا سا اعتدال ہونے کے سبب سے ہی اسلام کے اصول وضوابط کی ترویج و تشریح بڑے پیمانے پر ہو سکی۔ لیکن امام جعفر صادق کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کے معاملہ کو لیکر شیعہ فرقہ بھی دو حصوں میں بٹ گیا اور ایک فرقہ امام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کے نام سے منسوب ہونے کی وجہ سے اسماعیلی کے نام سے مشہور ہوا۔

امام جعفر صادق کے بعد پھر ایک بار اہلبیت رسالت کو مصائب و آلام کا شکار ہونا پڑا امام موسیٰ کاظم کی رحلت جیل خانے میں ہوئی اور آٹھویں امام حضرت علی رضا کو عرب کی سرزمین چھوڑ کر ایران کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں کے خلیفہ مامون رشید کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی چالوں کے اتار چڑھاؤ کی ایک طویل کہانی ہے جس کو بیان کرنا یہاں ممکن نہیں الغرض امام علی

رضا کو ایران کی سرزمین ہی راس آئی اور وہ عالم غربت میں خراسان کے شہر مشہد میں مدفون ہوئے۔ اس طرح ایرانیوں کو خاندان نبوت سے قربت کا ایک اور موقع ملا۔

عرب سے لیکر ایران تک اموی اور عباسی خلیفاؤں کی رسہ کشی اور خون خرابے سے اکتا کر سینکڑوں مسلمان ہندوستان کا رخ کرنا شروع کر چکے تھے۔ بالخصوص متوکل عباسی کے زمانے میں بڑی تعداد میں مسلمانوں نے عرب کی سرزمین کو خیر آباد کہا۔ یہی امن پرور لوگ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کا مقدس کام خاموشی سے کرتے رہے۔ جب مسلمان بادشاہوں کی نظر ہندوستان پر پڑی تو انھوں نے بھی سونے کی اس چڑیا کے پر کترنے کی فکر کی اور پھر غزنی اور غور کے لشکر بہ لشکر ہندوستان پر ٹوٹنے لگے۔ مسلمان لشکریوں کے پاس تبلیغ اسلام کے لئے لشکر کشی کرنے کے لئے اسلام کا نام ضرور تھا مگر عمل درآمد کے لئے سوائے تلوار کے کوئی راہ نہ تھی جبکہ اسلامی مبلغ صرف زبان و قلم سے اس کام میں منہمک تھے۔

مسلمانوں کے لشکروں کی آمد سے برسوں قبل ہی اسلام کی تبلیغ کا کام ہندوستان میں شروع ہو چکا تھا اس کے مسلم ثبوت موجود ہیں۔ اس وقت جو لوگ بھی یہاں آئے ان میں حنفی بھی تھے۔ شافعی مالکی ہنبلی اور شیعہ بھی مگر کسی نے بھی اپنے مسلک کی بات نہیں کی بلکہ صدق دل سے اسلام کے درس مساوات کی تبلیغ کرنا شروع کر دی۔

ادھر عرب و ایران کی سرزمین پر ظلم و جور کا پہاڑ توڑنے والے عباسی حکمرانوں کے دن پورے ہو چکے تھے اور ۱۲۵۸ء میں ہلاکو کی فوج نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ محمد حبیب نے ہلاکو کے حملہ کے بارے میں یہ الفاظ تحریر کئے ہیں۔ "۳۰ جنوری ۱۲۵۸ء کو (بغداد کا) محاصرہ شروع ہوا اور چھ دن تک چلتا رہا۔ ہلاکو نے چھ امان نامہ تیروں میں باندھ کر شہر میں پھینکنے کا حکم دیا ان امان ناموں میں قاضیوں، دانشمندوں، شیخوں، حضرت علی کی اولادوں (سادات) اور غیر مسلح افراد کو نقصان نہ پہنچائے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔"

اس طرح تیمور نے بھی اصفہان میں قتل عام کا حکم دیتے وقت قاضیوں اور سادات کی بستیوں کو اس سے علیحدہ رکھا تھا۔ ان دونوں بادشاہوں کے دل میں سادات کے لئے کافی احترام تھا۔

ہندوستان میں نور اسلام

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان گنت مسلمانوں نے عباسی اور اموی جھگڑوں سے تنگ آکر ہندوستان کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا اسی ضمن میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے دہلی سلطنت کے قیام کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ ”گو کہ ترکوں کے سیاسی اثرات کے پھیلاؤ کی راجپوتوں نے شمال میں غزنوی حکمرانوں کے عہد میں سختی سے مخالفت و مزاحمت کی لیکن مسلمان تاجر، علماء، صوفی اور مبلغ لوگ بغیر جنگ و جدل کئے اس ملک میں داخل ہوتے رہے۔ اور بہت سے اہم مقامات پر بس گئے۔ یہ لوگ عموماً ایسی بستیوں میں قیام پذیر ہوئے جو پسماندہ ذاتوں کے افراد کے لئے مخصوص تھیں اور جنھیں ہندوستانی سماج میں عزت ملنا تو درکنار بلکہ اچھوت سمجھا جاتا تھا ان کے ہاتھ سے کھانا یا پانی لینا بھی غلط سمجھا جاتا تھا ان لوگوں سے اس قدر نفرت کی جاتی تھی کہ اگر ان کے ہاتھ کا کوئی سامان کوئی اعلیٰ ذات کا شخص قبول کر بھی لیتا تھا تو اس کا سماجی بائکاٹ کر دیا جاتا تھا۔“

چوں کہ مسلمان مبلغ و علماء درس مساوات لیکر آئے تھے اس لئے انھوں نے ان ہی بستیوں کو اپنی جائے رہائش بنا کر تبلیغ اسلام کا کام شروع کر دیا۔ اس کے خاطر خواہ نتیجہ بھی بر آمد ہوئے اور صدیوں سے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے پسماندہ اقوام کے افراد اسلام کے پرچم مساوات کی چھاؤں میں آتے چلے گئے۔

ابن اثیر نے فتح السلاطین میں غوریوں کے حملہ سے تقریباً پچاس سال قبل بھی بنارس میں مسلمانوں کے پر امن طور پر آباد ہونے اور مذہبی امور کی انجام دہی کی تصدیق کی ہے۔

خلق احمد نظامی کی تحقیق کے مطابق بہرائچ (اتر پردیش کا ایک ضلع) میں سید سالار مسعود غازی کے مقبرہ کے آس پاس اور بدایوں، بلگرام، گوپا مئو، اناؤ، حاجی پور سمیت ایسے مختلف مقامات ہیں جہاں پر کئی مسلمان صوفیوں کے مزاروں پر غوریوں کے حملوں سے قبل کی تاریخ موجود ہے۔ کئی مزاروں کے سجادہ نشینوں کے دعوئی کے مطابق ان کے اجداد غوریوں

کے حملہ سے برسوں قبل ہندوستان آئے تھے اور یہیں بس گئے تھے۔

امام موسیٰ کاظم کے ایک شاگرد نے غالباً سب سے قبل سندھ میں آباد ہو کر تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔ جھولے لال کے نام سے مشہور ان صوفی بزرگ کا مزار پاکستان میں کراچی سے کوئی چار سو کلو میٹر دور واقع ہے۔ جن کو آج بھی ہزاروں مسلمان اور ہندو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان کو شاہباز قلندر کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ دراصل ایسے ہی ہزاروں مخلص مسلمان اسلام کا پیغام امن و آشتی لیکر ہندوستان میں آئے اور اسلام کا نور ہر طرف پھیلایا۔ شہباز قلندر حضرت علی کو بے انتہا چاہتے تھے ان انکے آستانے پر گائی جانے والی دمادم مست قلندر سخی شہباز قلندر علی کا پہلا نمبر والی قوالی زمانے بھر میں بہت مقبول ہوئی۔ مسلمان بادشاہوں نے ملک فتح کیے..... مگر دلوں کو فتح کیا تو انھیں مبلغان اسلام نے۔ کیونکہ تلوار سے حکومت تو پھیل سکتی ہے مذہب نہیں پھیل سکتا۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت عمر نے ایران کو فتح کیا اور وہاں کی حکومت کو زیر کیا لیکن وہاں کے عوام نے اس اسلام کو قبول کیا جو حضرت علی کے اولادوں کے ساتھ ایران آیا تھا۔ اسی طرح بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادینے والے فاتح منگول لشکر مسلمانوں کو اپنے مذہب کے دائرہ میں نہ لاسکا۔ بلکہ مسلمانوں کو مات دینے والے منگول خود ہی مسلمان ہو گئے۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنے والے مسلمان بادشاہ یہاں کے عوام کے دلوں کو نہ جیت سکے اور عوام نے اسلام کے دائرہ میں آنا قبول کیا تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت امیر خسرو، حضرت خواجہ بختیار کاکی، حضرت شاہ میناشاہ، حضرت سلیم الدین چشتی اور ایسے ہی ہزاروں پیران طریقت کی اخوت، محبت، اور آپسی بھائی چارہ کی تلقین کے سبب ہی ایسا ہو سکا۔

یہ صوفی بزرگ حضرات ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو مسلمانوں کو جوڑنے کی کڑی کا کام کرتا ہے۔ یہ حضرات صحابہؓ کرام اور اہلبیت رسول دونوں سے ہی اپنے وابستہ ہونے کا اعلان کرتے رہے۔ اولیاء کرام کا یہ رویہ جہاں مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہیں

اسلام کی ایک ایسی تصویر پیش کرنے میں بھی کامیاب ہوا جس میں عدم تشدد امن و چین اتحاد و ایکتا کے رنگ بھرے تھے۔ یہ لوگ ایک خدا ایک انسانیت کا پیغام لیکر سر زمین ہند پر وارد ہوئے اور پھر اپنے حسن سلوک کے رنگ میں یہاں کے عوام کو رنگ لیا۔ یہ محض ایک اتفاق تو نہیں کہ اکثر صوفی بزرگ پیغمبر حضرت محمد کی بیٹی حضرت فاطمہ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ خاندان رسالت کے لوگ امن پروری اور آپسی بھائی چارے کے سائے میں اسلام کی تبلیغ چاہتے تھے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔

مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آنے والی نسلوں نے ان بزرگان ملت کے فیوض و برکات سے استفادہ کرنے کے بجائے ان کے مزاروں کی پرستش کرنا شروع کردی۔ ان کے پیغام کو آگے بڑھانے کے بجائے چادر و گاگر کے جلوس نکالنا شروع کردئے، ان کے احسانات کے بدلے میں خود ان ہی سے منت و حاجات پوری ہونے کی طلب میں لگ گئے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت

ویسے تو سندھ کے علاقہ پر بنوامیہ کے حکمراں حجاج کے چچازاد بھائی محمد بن قاسم نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد محمد غوری اور محمود غزنوی کے حملوں کے ساتھ اس ملک پر قبضہ کرنے کا خواب بھی مسلمانوں نے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

مگر ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کی داغ بیل اصل میں ڈالی معزالدین غوری کے وائسرئے قطب الدین ایبک نے جو (قنوج کے راجہ دیلو کے نام پر آباد کئے گئے شہر) دلّی کا پہلا حاکم بنا۔ ایبک کی اچانک موت کے بعد آرام شاہ جیسے گمنام سپاہی نے دلّی کی حکومت سنبھالی اور اس کے بعد التتمش کو اقتدار حاصل ہوا۔ التتمش نے حقیقی طور پر ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی ۔ اس نے ملک کو دہلی کی شکل میں ایک راجدھانی عطا کی اور ایک بہتر نظام حکومت، صوبائی طرز حکومت کا تصور اور ایک حکمراں طبقہ دے کر غوریوں کے اقتدار والے کمزور ملک کو دلی کی مضبوط سلطنت میں تبدیل کر دیا۔

اور پھر نہ صرف مسلم معاشرہ نے بلکہ ہندوستان کے مقامی باشندوں نے ایک عورت کو حکمراں کے روپ میں تخت سلطنت سنبھالے دیکھا رضیہ سلطان ایسی پہلی مسلمان عورت ہوئی جس نے اقتدار پر بیٹھ کر گواہی دی کہ اسلام عورت کے ساتھ تفریق کا قائل نہیں۔ جب بات رضیہ سلطان کی آئی ہے تو ایک قصہ اور یہاں پر لکھنا ضروری ہے ہندوستان کی قدیم ترین مقدس کتاب منواسمرتی کے قوانین کے مطابق کوئی اچھوت پسماندہ ذات کا فرد حاکم ہونے کا تصور بھی کرے تو سخت سزا کا مستحق تھا۔ لیکن علماء مبلغان دین اور دیگر اسلامی شخصیات کی تعلیم و حسن و سلوک کے سبب یہاں کے اچھوت بھی اس قابل ہو گئے کہ مسلمانوں کے صرف نوّے سالہ دور اقتدار کے بعد تخت پر قدم جما سکیں۔

یو این ڈے نے اپنی کتاب دی گورنمنٹ آف دی سلطنت میں اس ضمن میں تحریر کیا ہے کہ "الہ دین خلجی نے یہاں کی عام رعایا اور گاؤں میں رہنے والے پسماندہ افراد کی فلاح کے لئے بہت اچھے اقدام کئے۔ اس نے نہ صرف اعلیٰ ذات کے مسلمانوں کو طاقت کو توڑا بلکہ ایسے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی بھی سر کوبی کی جنھوں نے یا تو اجداد سے ثروت و میں طاقت پائی تھی یا پھر نوے سال کے ترک نژاد غلام قبیلہ کی حکومت کے دوران اقتدار و طاقت حاصل کر لیا تھا۔

خلجی کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تک مذہب تبدیل کر کے اسلام میں شامل ہونے والے مقامی باشندوں اور ہجرت کر کے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے مابین حصول اقتدار کے لئے کشمکش چلتی رہی یہاں تک کہ ہندوستان کے تخت سلطنت پر خسرو پرواری نام کے ایک اچھوت کو بیٹھنے کا موقع بھی مل گیا لیکن اس کو ٹھاکروں اور دوسرے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی طرف سے مدد نہ ملنے اور نصر الدین خسرو شاہ نام کے اس پسماندہ دلت سے اعلیٰ ذات کے مسلمانوں کے ناخوش ہونے کے سبب غازی ملک نے دلی پر قبضہ کر لیا۔"

اس طرح اسلام نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا سنہری ورق بھی تحریر کیا جس میں ایک اچھوت اور پسماندہ ذات سے تعلق رکھنے والے فرد کو تخت پر بیٹھنے کا موقع مل گیا تھا ورنہ تخت سلطنت پر کسی اچھوت کے بیٹھنے کا مطلب تھا کل یگ کی آمد۔ اسلام کے مساوات کے پیغام

کو خود مسلمانوں کے ایک طبقے نے پھلنے نہیں دیا اگر خسرو پرواری کو کچھ برس حکومت کرنے کا موقع مل جاتا تو آج ہندوستان کے دلتوں کی قسمت بدل چکی ہوتی۔

بعد میں تغلق قبیلہ کو حکومت حاصل ہوئی اور غیاث الدین تغلق نے بھی پسماندہ ذات کے افراد کی حالت سدھارنے کی کافی کوشش کی مگر اس کو بدنامی ہی ملی غیاث الدین کے بعد فیروز تغلق نے طاقت ور طبقہ اور اونچی ذات والوں کو خوش رکھنے میں ہی بھلائی جانی۔

تیمور کی افواج نے ایران کے مختلف صوبوں میں تباہی مچانے کے بعد جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں تغلق قبیلہ کا راج تھا تیمور نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد جب یہاں سے واپسی کا ارادہ کیا تو تخت پر سیدوں کا حق مانتے ہوئے عنان حکومت سید خضر کو سونپ دی۔ سادات کی نسل صرف ۳۵ برس ہی حکمرانی کر سکی اور بعد میں دہلی کی سلطنت پر لودھی قبیلہ کا قبضہ ہو گیا۔

لودھی خاندان کا تسلط بابر کے حملہ کے ساتھ ختم ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ایران میں صفوی حکمرانوں نے ایران کا سرکاری مذہب اسلام شیعی ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

بابر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت کا ہندوستان ایک مسلم بادشاہ کے زیر اقتدار تھا مگر پھر بھی بابر نے کفر کو فنا کرنے اور اسلام کی روشنی پھیلانے کا نعرہ دیا گو کہ اس حملہ کا کفر و اسلام سے کوئی مطلب ہی نہ تھا۔

بابر گو کہ خود شیعہ مسلمان نہ تھا مگر شیعوں کے ساتھ اس کے گہرے روابط تھے اس کی فوج میں میر باقی تاشقندی جیسے شیعہ جنرل اور لاتعداد سپاہی شامل تھے۔ اور شیعوں سے یہ تعلقات اور زیادہ گہرے اس وقت ہو گئے جب "۱۵۱۲ء تا ۱۵۱۰ء میں سمرقند پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے بابر نے ایران کے بادشاہ اسماعیل صفوی سے مدد مانگی، تو اس نے بابر کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ پہلے ایران کی شیعہ سلطنت کو تسلیم کر۔ بابر نے اس شرط کو بخوشی قبول کیا یہی نہیں اس نے شیعوں کا مخصوص لباس بھی پہنا اور بارہ گوشوں والی قزلباشی ٹوپی بھی اپنے سر پر رکھی جو بارہ اماموں کی طرف جھکاؤ رکھنے کی دلیل مانی جاتی تھی۔

پروفیسر ای جی براؤن کے مطابق "بابر نے شیعوں کی طرف اس قدر جھکاؤ دکھایا کہ سنٹرل ایشیا کہ سنّی عوام اس سے ناراض ہو گئے۔" لیکن ایف ڈبلو بکلر نے لکھا ہے کہ "بابر نے جب ہندوستان کے مختلف حصوں پر قبضہ کرنے کے بعد لاہور کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو اس نے شیعہ فرقہ کی جو نقاب اپنے چہرے پر چڑھائی تھی اس کو اتار پھینکا اور خلفائے راشدین کے نام کے سکے جاری کئے۔"

لیکن ہندوستان پر بابر کے حملہ سے قبل ہی دکھن میں شیعوں کو ایک چھوٹی سی سلطنت بیجاپور کی شکل میں مل چکی تھی ۱۵۰۲ میں بیجاپور کے بہمنی گورنر یوسف عادل شاہ نے محمد گوان کے قتل کے بعد بیجاپور کے آزاد شیعہ سلطنت ہونے کا اعلان کر دیا ۱۵۰۳ء میں یوسف عادل شاہ کو سنّی فرقہ کی بغاوت کے سبب بھاگنا پڑا۔ شیعوں کی اذان میں حضرت علی کا نام شامل کئے جانے کے حکم سے سنّی فرقہ سخت نالاں تھا ریاست میں شیعہ سنّی فساد ہو گیا اور یوسف کو تخت چھوڑنا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد یوسف عادل شاہ کو جب دوبارہ تخت ملا تو پھر اس نے پرانی روش اختیار کرنے میں عجلت نہیں دکھائی اور شروع شروع میں کہا کہ ریاست سنّی المذہب رہے گی لیکن اقتدار جما لینے کے بعد یوسف نے شیعت کو ہی ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ شیعہ، سنّی کے نام پر رونما ہونے والا یہ پہلا فساد تھا۔ احمد نگر میں بھی بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد حسن نامی ایک بہمنی قیدی نے تخت پر قبضہ حاصل کیا اور احمد نظام شاہ کے نام سے نظام شاہی شیعہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔

گولکنڈہ میں ۱۵۱۲ء میں سلطان قلی قطب شاہ نے قطب شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ یہ حکومت شیعہ تھی یہی زمانہ تھا جب شیعوں میں سیاسی بیداری عروج پر تھی۔ اور ان کو سنٹرل ایشیا کی سیاست میں نمایاں مقام مل چکا تھا۔

ادھر شمالی ہندوستان میں بھی شیعوں کا تسلط اور اقتدار بڑھ رہا تھا کشمیر میں شیعوں کی بول بالا تھا مگر مرزا حیدر دغلت نے مغل افواج کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کر کے شیعوں کا استحصال کرنا شروع کر دیا لیکن صرف گیارہ برس کے اندر ہی ۱۵۵۱ء میں غازی چک نے مرزا حیدر کو شکست دے کر چک قبیلہ کی حکومت قائم کی جو عقائد کے اعتبار سے شیعہ تھی۔

"ادھر بابر کے بیٹے ہمایوں کو شیر جنگ سے مات کھا کر ایران بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ خراسان کے شہر مشہد مقدس میں ہمایوں نے امام رضا کے روضہ پر حاضری دی اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی واپسی کے لئے دعا کی اس نے چالیس دن کا چلہ بھی کھینچا مگر ان سب باتوں کو سنّی عوام کے خوف کی وجہ سے صیغۂ راز میں رکھا۔ چلہ پورا ہونے کے بعد وہ شیعہ حاکم شاہ تمہاسپ سے ملنے گیا شاہ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی یہاں تک کہ ہمایوں کے سر پر تاج بھی رکھا۔"

شاہ کے بیٹے بہرام مرزا کو ہمایوں سے سخت نفرت تھی اس نے شاہ تمہاسپ کو ہمایوں کے خلاف ایسا بھڑکایا کہ ہمایوں کو اپنی جان کا خطرہ اور گرفتار کئے جانے کا احساس ہونے لگا لیکن شاہ تمہاسپ کی بہن سلطانہ بیگم نے ہمایوں کا نظم کردہ ایک قصیدہ اپنے بھائی کو دیا جس میں حضرت علی کی شان میں اشعار کئے گئے تھے بادشاہ تمہاسپ مدح علی میں لکھا گیا قصیدہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اس نے نہ صرف یہ کہ ہمایوں کو معاف کر دیا بلکہ ہندوستان کی سلطنت واپس دلوانے کا عہد بھی کیا۔

کہا جاتا ہے ہمایوں نے شاہ تمہاسپ سے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو ایک شیعہ ملک کا درجہ دے گا لیکن ایک بار حکومت حاصل ہوئی تو ہمایوں پھر اتنی ہمت نہیں کر سکا کہ وہ اپنی سلطنت کو خطرہ میں ڈالے اس نے نہ تو اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کیا نہ ہندوستان کی مغل سلطنت کے شیعہ ہونے کا ہاں اس نے اپنے دربار میں شیعوں کو نہ صرف اعلیٰ عہدے دیئے بلکہ ان کا خاطر خواہ خیال بھی رکھا۔

بیرم خاں جیسے مدبر کے مشوروں کی بدولت تقریباً پندرہ سال تک ہمایوں اور صفوی مملکت کے مابین بہت دوستانہ تعلقات رہے وزیر آعظم کا درجہ رکھنے والے بیرم خاں جیسے شیعہ دانشور نے نہایت دانشمندی سے کام لیتے ہوئے شیعہ سنّی تنازعہ کو اٹھنے نہیں دیا۔

ہمایوں کی کتب خانے کے زینے سے پھسل کر موت ہو جانے پر اس کے نابالغ بیٹے محمد جلاالدین کو اکبر آعظم کے خطاب تک پہنچانے کے پیچھے بیرم خاں کی ہی سیاسی سوجھ بوجھ تھی اکبر کی کمسنی کے زمانے میں سارا راج کاج بیرم خاں کے ہاتھوں میں ہی تھا مگر بیرم خاں نے اپنے شیعہ عقائد کو یہاں کی سنّی و ہندو اکثریت پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی اور ملک کو سیاسی افراتفری سے

بچائے رکھا۔ اکبر نے جوان ہوتے ہی بیرم خاں کو اپنے راستے سے ہٹا کر دین الٰہی کے نام سے ایک نیا مذہب چلانے کی ناکام کوشش کی۔ مگر اکبر نے شیعوں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرنے کی روش کو چھوڑا نہیں۔ ابوالفضل، فیضی اور خاں خاناں جیسے شیعہ عالم وادیب اس کے بہترین ساتھی تھے اس کے نورتنوں میں سے پانچ شیعہ تھے۔ یہاں تک کہ اس نے ۱۵۵۹ء لاہور کے قاضی القفاۃ شیخ عبدل نبی کو جو کہ سنّی تھے معزدل کر کے شیعہ عقائد پر یقین رکھنے والے قاضی نوراللہ شوستری کا تقرر کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی اکبر نے کشمیر کی شیعہ چک حکومت پر ۱۵۸۶ء میں قبضہ کر کے ایک شیعہ حکومت کا خاتمہ بھی کر دیا۔

لیکن بعد میں اکبر کو دین الٰہی پھیلانے میں اتنی دلچسپی ہو گئی کہ نہ تو وہ شیعہ رہا نہ سنّی مگر میرے خیال میں دین الٰہی کا نعرہ ایک مذہبی نعرہ نہ ہو کر ایک سیاسی نعرہ تھا جس کے ذریعہ اکبر اس ملک کے چپہ چپہ میں پھیلے ہوئے مختلف اقوام کے لوگوں کو ایک کر کے اپنی حکومت پر پڑنے والے سیاسی دباؤ کو کم کرنا چاہتا تھا۔

اکبر کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے محمد نورالدین نے تخت خلافت پر جہانگیر کے لقب کے ساتھ قدم رکھا۔ جہانگیر کے تعلقات بھی ایران کی شیعہ حکومت سے بہتر رہے۔ اس کی چہیتی بیوی نورجہاں بھی عقیدہ کے اعتبار سے ایک شیعہ خاتون تھی۔

ویسے تو جہانگیر نے نہ کبھی شیعہ فرقہ کے خلاف کوئی بات کہی نہ کبھی ظلم وجور کی روش اختیار کی البتہ جہانگیر نے احمد نگر کی شیعہ سلطنت کا خاتمہ ضرور کیا اور ۱۶۳۳ء میں نظام شاہی شیعوں کا استحصال کیا لیکن یہ کام اس نے عقائد کی بنیاد پر نہیں سیاسی مصلحتوں کے تحت کیا تھا۔

لیکن جہانگیر نے اپنے عہد میں ایسا سنگین جرم بھی کیا جس کے لئے شیعہ فرقہ اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ جہانگیر نے اکبر کے متعین کردہ قاضی نوراللہ شوستری کو قاضی عبدل نبی اور دوسرے افراد کی چغلی پر سزائے موت دے دی۔ دراصل قاضی نوراللہ شوستری نے ایک کتاب احقاق الحق کے نام سے تحریر کی تھی جس میں شیعوں پر سنّی فرقہ کے بیجا الزامات کی تردید کی گئی تھی۔ سنّی علماء اس فکر میں تھے ہی کہ اکبر نے ان کو جس طرح ذلیل وخوار کیا ہے اس کا بدلہ وہ

چکائیں اور قلعہ آگرہ میں بیٹھے جہانگیر کو بھڑکائیں اس میں وہ لوگ کامیاب رہے۔ اور قاضی نوراللہ شوستری کو جہانگیر کے حکم سے نہ صرف سزائے موت دی گئی بلکہ ان کی زبان گدی سے کھینچ لی گئی قاضی نوراللہ شوستری کو آج شیعہ حضرات شہید ثالث کے نام سے یاد کرتے ہیں اور آگرہ میں ان کے مزار پر ہر سال مجلسیں بھی کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نور جہاں قاضی صاحب کو سزائے موت دیئے جانے سے بہت ناخوش تھی اور اس نے چغلی کرنے والے سنّی علماء سے چن چن کر مختلف بہانوں سے بدلہ بھی لیا لیکن یہ صرف وہ کہانیاں ہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں تاریخ میں اس بدلہ کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

دراصل جہانگیر نہ تو کٹر سنّی مسلمان تھا نہ اس کی شیعوں سے دشمنی تھی اس نے تو صرف سنّی عوام کا دل جیتنے کے لئے قاضی صاحب کو شہید کر دیا تھا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے قتل کو اتنے صیغۂ راز میں رکھا گیا کہ ایران کی صفوی حکومت تو درکنار خود آگرہ شہر کے لوگوں کو اس کی اطلاع نہ تھی اور ان کی لاش کو دفن کرنے والا بھی کوئی موجود نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے پیغمبر حضرت محمد کو خواب میں دیکھا اور انھوں نے شہید ثالث کی لاش کو عزت واحترام سے دفن کرنے کی ہدایت دی جس کے بعد خاموشی سے نوراللہ شوستری کو دفن کر دیا گیا۔

شاہ جہاں نے عنان حکومت سنبھالی تو اس نے نہ تو شیعوں کی مخالفت کی نہ ان پر کسی قسم کی سختی کی بلکہ اس کے دور اقتدار میں شیعہ علماء کی کافی قدر و منزلت رہی اس کی محبوب ترین بیوی ممتاز محل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایرانی النسل شیعہ خاتون تھی اور جس ممتاز محل کے لئے وہ تاج محل تعمیر کرواسکتا تھا اس کے عقائد پر بھلا چوٹ کیسے پہنچا سکتا تھا؟

اس کے بیٹے داراشکوہ نے تو کھلم کھلا شیعہ مذہب اختیار کر رکھا تھا جب کہ اورنگ زیب نے ایک کٹر سنّی کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ شاہ جہاں کا گھر شیعہ سنّی اتحاد کا مرکز بنا ہوا تھا جس میں سب کو اپنے اپنے عقائد کی آزادی تھی۔ گو کہ شاہ جہاں نے بھی ۱۶۲۵ء میں دکھن کی شیعہ حکومت پر حملہ کر کے ان کی اس بات کے لئے سرزنش کی کہ وہ لوگ خطبے میں ایران کی شیعہ حکمرانوں کا نام لیتے ہیں اس نے اس سلطنت سے خراج بھی وصول کیا لیکن یہ اس کی سیاسی مجبوری

تھی۔

مگر اورنگ زیب نے جب اپنے بھائیوں کو قتل کر کے اور اپنے بوڑھے باپ کو قید کر کے تختِ طاؤس پر قدم رکھا تو اس کے پاس خود کو حق پر ثابت کرنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ خود کو بہت زیادہ مذہبی اور کٹر ثابت کرے تاکہ مفتیانِ دربار یہ فتویٰ صادر کر سکیں کہ اورنگ زیب کا تخت نشین ہونا اسلام کی بقاء کے لئے بہت ضروری تھا۔

ویسے تو اورنگ زیب نے خود کو ایک کٹر سُنّی مسلمان ثابت کرنے کی جی توڑ کوشش کی مگر تعجب تو یہ ہے کہ اورنگ زیب کا وزیر اعظم ایک شیعہ ہی تھا۔ نعمت خان عالی کو اورنگ زیب کے دربار میں اچھا مقام ملنے کی ایک وجہ شائد یہ بھی تھی ایران کی صفوی حکومت کو بھی خوش رکھا جانا ضروری تھا۔ جے آر آئی کول نے روٹس آف نارتھ انڈین شیعہ ازم ان ایران اینڈ عراق میں فرانسی سیاح جے وی ٹاؤنر کے حوالے سے لکھا ہے کہ "بادشاہ کے خوف سے لوگ اپنا مذہب چھپانے پر مجبور تھے حالانکہ اورنگ زیب کے دربار میں بہت سے شیعہ تھے مگر انھیں اپنے مذہب پر عملدر آمد کرنے کی اجازت نہ تھی" بیجاپور کی شیعہ حکومت پر ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب کے حملہ کو بھی اس کی شیعہ مخالف طبعیت کا مظہر سمجھا جاتا ہے مگر مغل بادشاہوں میں کوئی بھی بادشاہ ایسا نہیں تھا جس نے اس طرح کی شیعہ حکومتوں کو تاراج نہ کیا ہو۔ کول نے تاریخ عالمگیری کے حوالے سے لکھا ہے کہ "برہان پور میں ۱۶۶۸ء میں اورنگ زیب کے حکم سے محرم کے موقع پر نکلنے والے تعزیہ کے جلوسوں پر پابندی لگادی گئی تھی۔" (ہندوستان میں تعزیہ کے جلوس پر یہ پہلی پابندی تھی) اورنگ زیب کے لئے شیعوں کی دشمنی کی سینکڑوں کہانیاں بھی موجود ہیں اور جس طرح ہندو حضرات اورنگ زیب سے بے انتہا نفرت کرتے ہیں شیعہ بھی اورنگ زیب کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن مزہ کی بات تو یہ ہے کہ اورنگ زیب کا سب سے بڑا بیٹا شاہ عالم شیعہ ہو گیا تھا۔ اور جس وقت گولکنڈہ کے حاکم ابوالحسن شاہ پر شاہزادہ شاہ عالم نے لشکر کشی کی تو گولکنڈہ کے حاکم ابوالحسن شاہ اور شاہ عالم شیعیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے قریب ہو گئے اور دونوں میں خط و کتابت شروع ہو گئی۔ لیکن ان خطوط میں سے کچھ خط اورنگزیب کے جاسوس کے

ہاتھ لگ گئے جس سے شاہ عالم کے شیعہ ہو جانے کا بھید کھل گیا۔ شاہ عالم کو ان کے خانوادہ سا تھ جیل میں ڈال دیا گیا اور نو برس کی قید ہوئی مگر قید کی مدت پوری ہونے کے بعد اورنگ زیب نے شاہ عالم کے تمام اختیارات واملاک اس کو بخوشی واپس بھی کردئے۔ اورنگ زیب کے چوتھے بیٹے اکبر شاہ نے بھی باپ کے خلاف بغاوت کی اور شیعہ مذہب اختیار کیا بعد میں شکست کھا کر مسقط فرار ہونے پر مجبور ہوا مسقط کے شاہ نے پہلے اکبر شاہ کو پناہ دی مگر بعد میں اورنگ زیب سے سودے بازی شروع کردی ایران کے صفوی بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو اس نے مسقط پر حملے کی دھمکی دے کر اکبر شاہ کو ایران بلوالیا۔ شہزادہ اکبر شاہ کو ایران کے شاہ نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ پناہ دی ۱۷۰۶ء میں ایران کے مقدس شہر مشہد میں شہزادہ اکبر شاہ کا انتقال ہوا اور اس کو امام رضا کے مزار سے کچھ فاصلے پر دفن کیا گیا۔

دراصل اورنگ زیب اور سادات بارہمہ کے بیچ کئی لڑائیاں ہوئیں اور ان کے سبب اورنگ زیب کو شیعوں کا جانی دشمن سمجھا جانے لگا جبکہ اورنگ زیب ظاہری طور پر کتنا ہی کٹر سنّی اپنے آپ کو ثابت کر رہا ہو اس کے گھر میں شیعیت کا بول بالا رہا جس کا یہ بین ثبوت ہے کہ اس کی دو اولادیں شیعہ ہو گئیں۔

اورنگ زیب اپنی زبردست فوجی قوت اور عظیم الشان سلطنت کے باوجود دہلی سے چند میل کے فاصلے پر واقع سادات بارہمہ کی حکومت کو توڑ نہ سکا۔ یہ جیالے شیعہ سید اورنگ زیب کی افواج کو مسلسل مات دیتے رہے۔ سادات بارہمہ اپنی بہادری اور جوانمردی کے سبب بے انتہا دبدبہ قائم کر چکے تھے۔ جیسے ہی اورنگ زیب کا انتقال ہوا بارہمہ کے سید عبداللہ خان اور سید حسین علی خاں کی مدد سے بہادر شاہ اول نے تخت طاؤس پر قدم جمانے کا شرف حاصل کر لیا اور تخت نشین ہونے کے فوراً بعد بہادر شاہ اول نے دو اعلان کئے پہلے کے ذریعہ تو جزیہ ٹیکس ختم ہوا اور دوسرے کے ذریعہ اذانوں میں حضرت علی کے خلیفۂ رسول ہونے کا اعلان شامل کیا گیا۔ اس طرح سب لوگ شیعوں کہ طرز پر اذان دینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ یعنی مغل سلطنت کے شیعہ ہونے کا اعلان ہو گیا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو یوسف عادل شاہ کی حکومت میں ہوا تھا ملک میں جگہ

جگہ فسادات پھوٹ پڑے۔ سنّیوں نے زبردست احتجاج کیا۔

گوالیار کے قلعہ میں سینکڑوں لوگ قید کیے گئے۔ احمد آباد کی ایک مسجد میں ایک موذن کو چاقو مار کر زخمی کر دیا گیا اور بعد میں ایک پر تشدد بھیڑ نے اس موذن کا خاتمہ کر دیا۔

جب فسادات حد سے زیادہ بڑھنے کا امکان ہو گیا تو بہادر شاہ اوّل نے اذان اور جمعہ کے خطبہ میں کی گئی تبدیلی کو منسوخ کر کے اس لی وہی شکل بحال کی جو اورنگ زیب کے زمانے میں تھی۔

پھر فرّخسیر کے چھوٹے سے دور حکومت میں بھی شیعہ سنّی فسادات ہوئے اور احمد شاہ کے دور میں بھی دہلی میں شیعہ سنّی فساد پھوٹ پڑا در اصل اس وقت سادات بارہمہ نے مغل بادشاہوں کے سروں پر تاج رکھنے اور تاج اتارنے کا کام اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا لیکن مغلوں کے ایک سردار (موسوی سید) میر محمد امین نواب برہان الملک نے سادات بارہمہ کو شکست فاش دے کر سادات بارہمہ کے زور کو توڑ دیا۔ نواب برہان الملک خود پکے شیعہ تھے۔ اس لئے سادات بارہمہ کی شکست سے ان کے رتبہ میں کافی اضافہ ہوا۔ نواب برہان الملک کو اپنے شیعہ بھائیوں کی سر کوبی کے انعام کے بطور سات ہزار گھوڑ سواروں کی سرداری اور اکبر آباد کی گورنری سے سر فراز کیا گیا۔ مغل سلطنت کے سر پر مسلط شدہ سادات بارہمہ کو شکست دینے کے علاوہ نواب برہان الملک نے مرہٹوں کو بھی مات دی اور کوڑہ کے زمیندار بلونت سنگھ کی بھی سر کوبی کی۔ لکھنؤ میں داخل ہوتے وقت نواب برہان الملک کو شیخ زادوں کی مدافعت کا سامنا کرنا پڑا مگر نواب نے شیخ زادوں کو مات دے کر مچھی بھون پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ اس کے بعد نواب برہان الملک لکھنؤ سے ایودھیا چلے گئے اور وہیں سرجو ندی کے کنارے ایک بنگلہ بنوا کر قیام پذیر ہوئے۔ (ایودھیا کے پاس واقع فیض آباد شہر اسی دور میں آباد ہوا اور کافی عرصہ تک اودھ کی راجدھانی رہا۔) نواب برہان الملک کی بہادری اور وفاداری کا رعب ہر طرف بیٹھ چکا تھا ملک کے کسی بھی کونے میں کوئی سردار ایسا نہ تھا جو ان کو چیلنج کرتا۔ مغل سلطنت بھی ان کی بہادری اور جانبازی سے بہت خوش تھی۔ اس طرح مغل سلطنت کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو کچھ کچھ کنارہ ملنے لگا اور محمد شاہ رنگیلے کو عیش و

عشرت بھرے کچھ لمحات بھی میسر ہو گئے اور مغلوں کے دربار میں رنگنیاں جھلکنے لگیں۔ ابھی مغل سلطنت پوری طرح کیف و مستی میں ڈوبنے بھی نہ پائی تھی کہ ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے ۱۷۳۸ء میں حملہ کر دیا۔ ایسے میں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مغل دربار کو ایک بار پھر برہان الملک کو آواز دینی پڑی۔ نادر شاہ ویسے تو ایک شیعہ مسلمان تھا اور تاریخ میں جابجا یہ بات ملتی ہے کہ نادر شاہ نے ترکوں پر فتح پانے کے بعد کربلا جا کر امام حسینؑ کے روضہ پر اور نجف میں حضرت علیؑ کے روضہ پر جا کر سر نیاز خم کیا اسی طرح اس نے مشہد پر قبضہ کرنے کے بعد امام رضا کے روضہ پر بھی حاضری دی تھی۔ نادر شاہ کا تعلق افشار قبیلہ سے تھا۔ اور یہ قبیلہ ایران کو شیعہ ملک قرار دئے جانے کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک تھا۔ نادر نے ایک خط میں ترکوں پر اپنی فتح کو شیعوں کی فتحیابی سے سے تعبیر کیا تھا۔

مگر نادر شاہ اس وقت ایک سنّی مسلمان کی نقاب اوڑھ کر سامنے آیا تھا وہ ہندوستان پر حملہ کرنے سے قبل ہی ایران کو ایک سنّی ملک بنائے جانے کا اعلان کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے شیعوں پر کئی پابندیاں عائد کر دیں۔ اور شیعوں کو جعفری کہہ کر پکارے جانے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔

مورخوں کا خیال ہے کہ نادر شاہ کی یہ ایک سیاسی چال تھی کیوں کہ وہ خلیفۃ المسلمین بننے کا خواب اپنی آنکھوں میں سجائے تھا۔ خلیفۃ المسلمین بننے کے لئے دو باتیں نہایت ضروری تھیں پہلی تو یہ کہ خود کو سنّی ثابت کیا جائے اور دوسری یہ کہ ہندوستان پر قبضہ کئے بغیر یہ لقب حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

نواب برہان الملک نادر کا حملہ روکنے کے لئے ایک بڑے لشکر کے ساتھ گئے مگر کامیاب نہ ہوئے شکست کھانے کے بعد انھوں نے محمد شاہ رنگیلے اور نادر کے بیچ گفتگو کروانے کا ذمہ لیا۔ مگر کچھ لوگوں نے یہ تصور کیا کہ نواب سعادت نے غداری کی۔ خود نواب سعادت اس شکست اور بے جا الزامات سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ راستہ میں ہی انتقال کر گئے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نواب سعادت نے زہر پی کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ نواب سعادت کی لاش کو

بعد میں کربلائے معلی لے جاکر دفن کیا گیا۔

اودھ کے نوابین کا عروج

نواب سعادت کی افسوسناک رحلت کے بعد اودھ میں ان کی جانشینی کے دو دعویدار تھے ایک نواب شیر جنگ جو نواب سعادت کے بھتیجے تھے اور دوسرے نواب صفدر جنگ جو نواب سعادت کے بھانجے اور داماد تھے۔ ویسے بھی نواب سعادت شیر جنگ سے ناخوش تھے اور ان کی جگہ نواب صفدر جنگ کو اپنی غیر موجودگی میں راج کاج کی ذمہ داری سونپ کر گئے تھے۔

محمد شاہ رنگیلے کی خواہش تھی کہ شیر جنگ نواب سعادت کے جانشین ہوں مگر اودھ کے وزیر آعظم راجہ لکشمی نارائن کی خواہش تھی کہ نواب صفدر جنگ کو ہی حکمرانی ملے۔ انھوں نے اس سلسلے میں نادر کو مطلع کیا۔ نادر نے نواب صفدر جنگ کی تقرری کے لئے محمد شاہ رنگیلے کو حکم دیا نواب صفدر جنگ کو مزید آزادیوں کے ساتھ خلعت و منصب عطا ہوا اور نواب صفدر جنگ نے اودھ کی گورنری مل جانے کے عیوض نادر شاہ کو دو کڑور روپے کا نذرانہ بھجوایا۔ نادر شاہ نے مغلوں کو بے تاج تو نہیں کیا البتہ ان کے اقتدار کی علامت بن جانے والا تخت طاؤس اور کوہ نور اپنے ساتھ ضرور لے گیا تاکہ مغل بادشاہ اسے ہمیشہ یاد رکھیں۔ نواب صفدر جنگ ایرانی النسل شیعہ مسلمان تھے۔ ان کے دور میں دور دور سے شیعہ علماء و ادیب اور فنکار ملک کے دوسرے خطوں سے ترک سکونت کر کے اودھ میں آکر بسنے لگے۔ کچھ ہی برسوں کے بعد نواب صفدر جنگ کو احمد خاں بنگش کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کا سامنا کرنے کے لئے دہلی دربار نے طلب کیا۔ نواب صفدر جنگ نے بہت جواں مردی سے احمد خاں بنگش سے معرکہ آرائی کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ نواب صفدر جنگ کی ناکامی سے احمد خاں بنگش کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ اس نے اپنے بیٹے کی قیادت میں پٹھان فوجوں کو لکھنؤ پر قبضہ کے غرض سے بھیجا۔

لکھنؤ کے محاذ پر بنگش خاں کی فوجوں کو یہاں کے قدیمی محافظوں یعنی شیخ زادوں کا سامنا کرنا پڑا جو نواب صفدر جنگ کے وفادار ہو چکے تھے۔ یہاں کے شیخ زادوں نے اس قدر بہادری اور

جوانمردی سے یہ لڑائی لڑی کہ پٹھانوں کو بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ۱۷۵۳ء میں نواب صفدر جنگ اور احمد خاں بنگش کے مابین صلح ہو گئی اور اس صلح نامہ پر دستخط کرنے کے کچھ ہی روز کے اندر ۱۷۵۴ء میں نواب صفدر جنگ کا انتقال ہو گیا۔ ان کو دہلی کی مشہور درگاہ شاہ مرداں کے نزدیک دفن کیا گیا جس پر بعد میں ایک خوبصورت روضہ بھی تعمیر ہوا۔

ان تمام واقعات پر غور کیا جائے تو عجیب وغریب سی صورت سامنے آتی ہے غوری سے لیکر تیمور تک اور بابر سے لیکر اورنگ زیب تک شیعہ سنّی عقائد کی بازگشت تو سنائی دیتی ہے لیکن کہیں بھی یہ اختلاف مذہبی بنیادوں پر دکھائی نہیں دیتا ملکہ اس اختلاف کے سہارے یا تو اپنی حکومت کو بچانا مقصود تھا یا پھر دوسرے کی حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنا تھیں۔

سادات بارہمہ کو اورنگ زیب بھی زیر نہ کر سکا لیکن ایک اور شیعہ سید نے اپنے سنّی برادران کے تخت وتاج کی حفاظت کے لئے سادات بارہمہ کا زور توڑا اور مغل حکومت کے لئے سر درد بنے ہوئے اس مسئلہ کو ختم کیا۔ پھر اسی برہان الملک کو دہلی کی فوج نے نادر شاہ کے حملہ روکنے کے لئے طلب کیا۔ مزہ کی بات تو یہ کہ نادر شاہ شیعہ تھا اور برہان الملک بھی شیعہ تھے مگر نادر شاہ امیر المسلمین بننے کے لئے سنّی بن گیا تھا جب کہ برہان الملک شیعہ ہو کر سنّی بادشاہ کا تخت وتاج بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسی طرح سنّی عقیدہ سے تعلق رکھنے والا احمد خاں بنگش دہلی کی سنّی حکومت کے لئے مسئلہ بن گیا تو پھر نواب صفدر جنگ جیسے شیعہ کو اس سے ٹکر لینا پڑی۔ اور جب نواب صفدر جنگ کی حکومت پر خطرہ آیا تو لکھنو کے سنّی عقیدہ سے تعلق رکھنے والے شیخ زادوں نے سنّی پٹھانوں سے جم کر لوہا لیا اور انھیں مار بھگایا۔ میرے خیال میں اودھ کی حکومت کو بچا کر سنّی شیخ زادوں نے اپنے شیعہ بھائیوں کو ایسا تحفہ دیا تھا جس سے شیعہ ثقافت وتہذیب کو پنپنے کا بہترین موقع ملا۔ ویسے نواب صفدر جنگ کے عہد میں شیعہ سنّی اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ مولانا عبد العلی فرنگی محلی نے روہیلہ پٹھانوں کو مجاہدین اسلام کے خطاب سے نوازا اور صفدر جنگ کے خلاف ہونے والی معرکہ آرائی کو جہاد اسلامی کا نام دیا۔ دوسرے موقع پرست لوگوں نے نواب

صفدر جنگ کے ساتھ نادر شاہ کی فوج کے چھ سات ہزار سپاہی ہونے کی وجہ سے اس معرکہ آرائی کو شیعہ سنّی جنگ قرار دیا جبکہ اس کے پیچھے افغانی وایرانی نسل پرستی کی بو آرہی تھی۔ بہر حال شیخ زادوں کی حمایت نے اس چال کو بھی ناکام کر دیا۔

نواب صفدر جنگ کے انتقال کے بعد نواب شجاع الدولہ نے حکومت سنبھالی۔ لیکن ان کی تقدیر میں شائد میدان جنگ ہی لکھا ہوا تھا۔ نواب شجاع الدولہ اپنے خطاب کے مطابق بے انتہا شجاع و بہادر تھے۔ اور عیش پرستی سے ان کا دور کا واسطہ نہ تھا۔

۱۷۶۱ء میں انھوں نے احمد شاہ درّانی، نجیب الدولہ اور روھیل کھنڈ کی افواج کے ساتھ مل کر پانی پت کے میدان میں مراٹھوں کا جم کر مقابلہ کیا اور انھیں مات دے کر مراٹھوں کے اس آئینہ کو چکنا چور کر دیا جس میں وہ ہندوستان پر راج کرنے کا خواب سجائے تھے۔ پانی پت کی اس معرکہ آرائی میں شیعہ سنّی اور ہندو افواج نے مل کر مراٹھوں کو مات دی۔

اس کے چار برس بعد انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور عیاریوں نے بے نقاب ہو کر سامنے آنے کا فیصلہ کیا نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کے مابین بکسر کے میدان لڑائی ہوئی۔ نواب کو شکست ہوئی اور انگریزوں کو اودھ کے معاملات میں دخل اندازی کے اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس کے بعد انگریزوں کو سارے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے صرف آٹھ نو دہائیوں کی ضرورت ہی رہ گئی۔ نواب شجاع الدولہ کی اہلیہ بہو بیگم صاحبہ بہت ہی زیادہ مذہبی خاتون کی تھیں خود نواب شجاع الدولہ بھی خوش عقیدہ شیعہ تھے بہو بیگم صاحبہ محرم کے مراسم میں بہت دلچسپی لیتی تھیں جس سے کہ عزاداری کو کافی فروغ ملا خود نواب شجاع الدولہ کے لشکر کے ساتھ محرم کے زمانے میں تعزیہ و علم بھی چلتے تھے اور لڑائی کے لمحات سے فرصت پانے کے بعد ذکر واقعات کربلا و مرثیہ خوانی کی مجالس کا اہتمام ہوتا تھا۔ لیکن شیعہ سنّی نفاق کی بو کہیں نہیں تھی۔ نواب خود تو شیعہ تھے مگر قاضی القضاۃ کا عہدہ فرنگی محل کے سنّی علماء کے پاس ہی تھا۔ علمی درسگاہ بھی سنّی علماء کی نگرانی میں چل رہی تھی جس میں شیعہ طالب علم بھی مذہبی درس حاصل کرتے مگر کچھ فتنہ باز لوگ ایک سنگین مسئلہ سے اودھ کو دوچار کرنا چاہتے تھے۔

پہلا شیعہ سنّی فساد

۱۸۳۳ھ میں لکھنؤ کی مشہور علمی درسگاہ فرنگی حویلی (محل) میں بنگال کے دو سنّی طالب علموں میں آپس میں تکرار ہوئی ایک نے دوسرے کو یزید کی اولاد کہا تو دوسرے نے اس کو شمر کا بیٹا کہا۔ کچھ شیعہ حضرات بھی وہاں موجود تھے اور ان میں سے مرزا رضی نامی ایک شخص نے (جو حکیم محمد شفیع کا بیٹا تھا) اس مباحثہ کو سننے کے بعد کہا کہ فرنگی محل خوارج کا گھر ہے اور خوارج کا جھمگٹا مولوی محمد حسن کے وجود سے ہے ایسی تدبیر کرنا چاہئیے کہ مولوی محمد حسن ہی درمیان سے اٹھ جائیں۔

فرحۃ الناظرین میں تحریر شدہ اس اقتباس پر گو کہ یقین کرنا مشکل ہے کیونکہ دو بنگالیوں میں ہوئی تکرار میں کسی نے بھی شیعوں کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ (اس وقت تک لکھنؤ سنّی فرقہ کے لئے بھی یزید و شمر کی اولاد ہونا گالی تھا اس واقعہ سے بہر حال یہ بات ثابت ہوتی ہے)

اس واقعہ کے سال بھر بعد ۱۸۴۴ھ میں چھ محرم کو فرنگی محل پر کچھ بدمعاشوں نے اس غرض سے حملہ کیا کہ ملّا محمد حسن کو ختم کر دیا جائے۔ مگر ملا محمد حسن تو بچ گئے اس حملہ میں ایک طالب علم خیر اللہ حسینی کی جان چلی گئی۔ اس ہنگامہ کے بعد کوتوال شہر نے سخت اقدامات کئے اور رات سکون سے بسر ہوئی مگر ے محرم کی صبح کو ملا محمد حسن نے میر خیر اللہ حسینی کے جنازہ کو شاہ پیر محمد کے ٹیلہ پر لے جا کر اعلان کیا کہ جس کو بھی اسلام کا پاس ہو وہ یہاں آ جائے۔ ملاّ حسن نے اس واقعہ کو حکومت کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا اس لئے انھوں نے محمدی جھنڈا بلند کر کے شہر میں بغاوت کروانا چاہی مگر صرف پانچ ہزار لوگ ہی ان کی آواز پر یکجا ہوئے۔ پانچ ہزار کا مجمع حکیم محمد شفیع کے مکان پر حملہ کر کے ان کے بیٹوں مرزا رضی اور مرزا ہجو کو سبق سکھانا چاہتا تھا جن پر ان کو شبہ تھا کہ میر خیر اللہ حسینی کو قتل کئے جانے کے معاملہ میں شریک ہیں حکیم محمد شفیع کا گھر معالی خاں سرائے میں تھا۔ یہ ہجوم ٹیلہ شاہ پیر محمد سے روانہ ہو کر سید عبد الرحیم بخاری

کے مزار پیر بخارہ تک پہنچا تو مالی خاں کے سرائے میں آباد سنّی پٹھانوں نے ملا محمد حسن کو پیغام بھجوایا کہ مرزا محمد شفیع کے لڑکوں کا اس قتل میں ہاتھ نہیں ہے۔ ان افغانی پٹھانوں نے نہایت دانشمندی سے کام لیتے ہوئے شیعہ سنّی ہنگامہ کو ٹال دیا اور مرزا محمد شفیع کے لڑکوں سے ملا محمد حسن کی موجودگی میں مسجد بہرہ مند خاں میں قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھلوائی کہ ان کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے افغانی پٹھانوں کا شہر میں کافی رعب تھا اس لئے بھی مجمع کو واپس ہونا پڑا۔ میر خیر اللہ حسینی کی لاش کو باغ مولوی انوار کے نام سے مشہور قبرستان میں دفن کر دیا گیا اور ہجوم منتشر ہو گیا۔

لیکن ملا محمد حسن ابھی بھی راضی نہیں تھے۔ ۸ محرم کو جمعہ کے خطبہ میں بھی انھوں نے کافی شعلہ بیانی سے کام لیا اور شہر میں شیعہ سنّی تناؤ پھیل گیا۔ اسی دن فرنگی محل سے جلوس علم گزرا تو اس پر شدید پتھراؤ ہوا۔

حاکم شہر مقبول خواجہ سرا نے پتھراؤ کرنے والوں پر سختی کرنے کی غرض سے ہاتھی ریل کر فرنگی محل کا پھاٹک توڑ دیا اور پتھراؤ کرنے والوں کو منتشر کرنے کے لئے گولیاں چلوائیں جس سے میر محمد عطا نامی ایک شخص ہلاک ہو گیا فرحۃ الناظرین میں اس واقعہ کو یوں تحریر کیا گیا ہے۔

"ملا حسن نے اس صورت حال کے پیش نظر مسجد فرنگی حویلی کی پشت سے پھاند کر سرائے ہرن والی کی طرف راہ فرار اختیار کی اس وقت فرنگی حویلی میں جو آفت برپا تھی وہ ناگفتہ بہ تھی اس اثنا میں کنیزوں اور حویلی کے دوسرے مردوں نے اندر کا پھاٹک بند کر کے چھت پر سے اپنے بچاؤ میں اینٹ و پتھر برسانا شروع کر دئے! بارش کی طرح برسنے والے اینٹ پتھر کی یہ شر پسند تاب نہ لا کر فرنگی حویلی سے باہر نکل آئے اور خوش تھے کہ ملا حسن کو قتل کر دیا"۔ ملا حسن اور دوسرے ساکنان فرنگی محل لکھنو سے اپنی جان بچا کر فیض آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔

نواب شجاع الدولہ کو جب اس افسوسناک واقعہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے حیدر گڑھ (ضلع بارہ بنکی) میں مامور چانٹر آرمینی کی پلٹن کو لکھنؤ کوچ کا حکم دیا اور فسادیوں سے سختی سے نبٹنے کی ہدایت کی اور یہ بھی حکم دیا کہ جن لوگوں نے فرنگی حویلی پر حملہ کیا ہے ان کے سر تن سے جدا

کر کے حاضر دربار کئے جائیں۔ مقبول خواجہ سرا کی گرفتاری کے احکامات بھی صادر ہوئے۔ مقبول خواجہ سرا نے فیض آباد پہنچ کر نواب کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے حملہ نہیں کیا بلکہ علم کے جلوس پر پتھراؤ کی وجہ سے یہ صورتحال پیدا ہوئی۔

فرنگی حویلی کے رہنے والے حضرات عشرہ محرم کے بعد فیض آباد پہنچے اور انھوں نے عبدالرحمن خاں و محمد سعید خاں قندھاری کے گھر میں قیام کیا فیض آباد میں جب سنّی حضرات پر حملہ کی خبر ہوئی تو وہاں بھی تناؤ پیدا ہو گیا اور فساد کا اندیشہ ہو گیا۔ نواب شجاع الدولہ نے اس فساد کو ٹالنے کے لئے شیخ مراد اللہ کی خدمات حاصل کیں جو فرنگی حویلی کے مفتی محمد یعقوب کے شاگرد تھے۔ شیخ مراد اللہ نے مفتی محمد یعقوب صاحب کو (جو شیخ مراد کے گھر میں ہی مقیم تھے) معاملہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا مفتی صاحب کے بیچ میں پڑ جانے کی وجہ سے اور مقبول خواجہ سرا کی زبانی علم پر پتھراؤ کے واقعات کا علم ہو جانے کے سبب ملا حسن کا مقدمہ کمزور ہو گیا اور ملا حسن کو ایسا محسوس ہوا کہ مقبول خواجہ سرا اور اس کے ساتھیوں کو نواب صاحب سزا نہیں دیں گے تو انھوں نے شجاع الدولہ سے ملاقات کئے بغیر شاہجہاں پور میں روہیلہ پٹھانوں کی پناہ میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

شجاع الدولہ ہر چند ایک شیعہ نواب تھے مگر سنّیوں کے لئے ان کے دل میں ذرا بھی تعصب نہ تھا خود مفتی رضا انصاری فرنگی محلی نے فرحتہ الناظرین اور اس کے مصنف کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں لکھا ہے "اودھ کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ اودھ کے ابتدائی حکمراں برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ صاحبان سیف تھے جن کے حوصلوں کے سامنے مذہبی تعصب کی کوئی اہمیت نہ تھی عقائد مذہبی میں رسوخ کا معاملہ الگ ہے مگر یہ رسوخ تعصب کی شکل اختیار نہیں کر پایا تھا۔"

نئی راجدھانی لکھنؤ

۱۷۷۵ء میں نواب شجاع الدولہ نے اس دار فانی سے کوچ کیا اور ان کے بیٹے یحییٰ علی

خاں نے نواب آصف الدولہ کا لقب اختیار کر کے باپ کی جانشینی اختیار کی۔ نواب آصف الدولہ نہ تو اپنے والد کی طرح صاحب سیف تھے اور نہ مرد میدان بلکہ ان کی زندگی عیش پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی ان کے عادت واطوار سے ان کے والد بہت پریشان و عاجز رہے۔ والد کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ نے اودھ کے دارالسلطنت کو فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جو بعد میں شیعہ ثقافت وتہذیب کا مرکز بنا۔ نواب کو فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی اس لئے یہاں ہندوستان کے گوشے گوشے سے فنکار آکر بسنے لگے۔ لکھنو کی تاریخ بہت مختصر الفاظ میں خاندان اجتہاد کے ایک اہم فرد مرحوم علی سرور صاحب نے اپنی یادداشت میں ان الفاظ میں تحریر کی ہے جو ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش ہے علی سرور صاحب نے بھلے ہی کچھ جگہوں پر مبالغے سے کام لیا ہے لیکن پھر بھی انداز بیان دلچسپ ہے اور کافی حد تک حقیقی لگتا ہے اور اس سے کم الفاظ میں لکھنؤ کی تاریخ بیان کرنا ممکن بھی نہیں ہے اور تحریر کرنا ضروری بھی ہے ۵ نومبر ۱۹۳۷ء کے صفحہ پر لکھتے ہیں۔

"کٹ چکا وہ عہد جب دل تھے فدائے لکھنؤ

پچھلی راتوں کو صدا آئی ہے ہائے لکھنؤ"

"شہر لکھنؤ کی قدیمی آبادی کا پتہ قیاساً ہزاروں برس پیشتر سے ملتا ہے اس لئے کہ جب رام اور لچھمن دونوں بھائیوں کو بن باس ہوا اس وقت صوبہ اودھ کے میدانوں کو طے کرتے ہوئے دونوں بھائی مع سیتاجی کے شہر لکھنؤ دریائے گومتی کے کنارے ٹیلے پر آباد ہوئے اس کے بعد ٹیلہ جو اس وقت شاہ پیر محمد کے ٹیلے کے نام سے موسوم ہے سینکڑوں برس لچھمن ٹیلے کے نام سے مشہور رہا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ لکھنؤ ہزاروں برس پہلے سے آباد ہے۔ چار سو برس پہلے جبکہ اکبر بادشاہ آگرہ میں بادشاہ تھے اسی شہر میں ایک خونخوار ڈاکو لکھن ناؤنامی گزرا اس ظالم ڈاکو کے انسانوں کے سروں کی نہاری پکتی تھی۔ جب اکبر بادشاہ کو خبر ہوئی تو فوراً لکھنؤ کا ارادہ کیا اور بڑی جانفشانی سے لکھن ناؤ کو زندہ چنوا کر پھاٹک کی تعمیر کرائی اور اس دروازہ کا نام اکبری دروازہ رکھا اور یہی سب

سے پہلی شاہی عمارت شہر میں قائم ہوئی۔ ''لکھنؤ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گومتی ندی میں اس وقت تقریباً ایک لاکھ ناویں چلتی تھیں اسی مناسبت سے اس کا نام لاکھ ناؤ پڑا اس کے بعد لاکھن پور پھر لکھنوتی اور بعد میں اس کو لکھنو کہا گیا حقیقت جو بھی ہو لکھنو کا تاریخ ہندوستان میں کوئی مقام اودھ کے حکمرانوں سے قبل تھا ہی نہیں اور اس بے نام و نشان شہر کو دنیا کے نقشے پر ابھارنے والوں میں آصف الدولہ بہادر سر فہرست ہیں۔

مولانا سید دلدار علی (غفرانماب)

رائے بریلی ضلع نصیر آباد سے مولانا دلدار علی صاحب ۱۷۷۹ء میں لکھنو آئے اور نواب آصف الدولہ کے وزیر سرفرازالدولہ سے مدد حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بمبئی سے عراق کے شہر بصرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک زبردست بحری طوفان نے ان کے جہاز کو ڈھکیل کر پھر بمبئی کے ساحل پر پہنچا دیا۔ مگر مولانا دلدار علی نے ہمت نہیں ہاری اور وہ سندھ کے راستے کراچی پہنچے اور وہاں سے بحری جہاز کے ذریعہ عراق کا سفر طے کیا (کول کے مطابق وہ راجستھان کے صحرا سے ہوتے ہوئے عراق تک پہنچے۔)

مولانا سید دلدار علی شیعوں کے دسویں امام حضرت علی نقی کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے دینی علوم کی تعلیم دو مقتدر سنّی علماء سے حاصل کی تھی۔ ملا محمد حسن فرنگی محلی اور ملاّ عبدالعلی فرنگی محلی ان کے استاد تھے۔ (یہاں پر ایک خاص بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ کہ کئی تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ سید دلدار علی صاحب نے فرنگی محل میں ہی درس حاصل کیا بالکل غلط ہے۔ جب کہ مولانا دلدار علی نے شاہجہاں پور جا کر ملا محمد حسن اور ملا عبدالعلی فرنگی محلی سے تلمند اختیار کیا تھا۔ ملا محمد حسن اور ملا محمد عبدالعلی لکھنؤ کے پہلے شیعہ سنّی فساد کے بعد روھیلہ پٹھانوں کی پناہ میں جا کر رہنے لگے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد جب مولانا دلدار علی عراق سے وطن واپس آئے تو وہ ایک مجتہد جامعہ الشرائط بن چکے تھے ۱۷۸۱ء میں وزیر اعظم سرفرازالدولہ نے مولانا دلدار علی کی ملاقات نواب آصف الدولہ سے کروائی۔ نواب نے مولانا کو بہت عزت و

احترام کے ساتھ وعظ کے لئے دعوت دی۔

نواب آصف الدولہ اسلامی شریعت کے برخلاف بہت بڑی بڑی موچھیں اور بھنگ پینے کا شوق رکھتے تھے۔ اس لئے کچھ لوگوں نے مولانالانا دلدار علی سے فرمائش کی وہ ان دونوں چیزوں پر تنقید نہ کریں تو نواب صاحب خوش ہوں گے۔ مگر جب وعظ شروع ہوا تو مولانا دلدار علی نے نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بھنگ کے استعمال اور لمبی مونچھوں کی مخالفت کو ہی اپنی تقریر کا موضوع قرار دیا۔ سب درباری سکتہ کے عالم میں وعظ سنتے رہے اور سب کو توقع تھی کہ نواب آصف الدولہ آج برافروختہ ہو جائیں گے لیکن وعظ ختم ہوتے ہی نواب آصف الدولہ نے بہت عقیدت و احترام کے ساتھ مولانا سے مصافحہ کیا اور لمبی لمبی غیر اسلامی مونچھوں کو تراش کر منشیات کو ہاتھ نہ لگانے کا عہد کیا اور بھنگ کے سارے مرتبان توڑ ڈالے۔

نواب آصف الدولہ نے انہیں مجتہد العصر کا درجہ دیا۔ مگر پھر بھی قاضی القضاۃ کا عہدہ فرنگی محل کے سنّی علماء کے ہاتھ میں ہی رہا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے گزشتہ لکھنو میں تحریر کیا ہے "مولانا دلدار علی کو فرنگی محل کے سنّی علماء کی رائے سے اور ان کے ہاتھوں ہی سے مجتہد العصر کے عہدہ پر فائض کیا گیا"۔

مگر اٹھارویں صدی کے اوائل میں انگریزوں نے اسلام کو نابود کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کو عملی شکل دینے کا کام ان کے ہزاروں جاسوس رات دن کر رہے تھے۔ کہیں وہ اسلامی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو کہیں وہ نئے نئے فرقہ ایجاد کرنے کا کام کر رہے تھے تو کہیں مسلمانوں کو آپس میں لڑوا کر انھیں کمزور کر رہے تھے۔ اٹھارویں صدی میں تینوں مسلم شہنشاہیوں کا زوال اسی سازش کی کڑی تھا جس سے تمام مسلمان بے خبر تھے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کی سمت سے ملک کو نگلنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور مغلوں کی سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی خود مختاری میں سمٹنے لگی تھی اور کمپنی بہادر کو روز بروز اختیارات حاصل ہوتے جا رہے تھے۔ اسی طرح صفوی بادشاہوں کو افغان قبیلوں نے ۱۷۲۲ء میں شیعہ سنّی تعصب کی بنا پر ختم کر دیا تھا اور یہ علاقہ برٹش حکومت کے لئے فائدہ مند بن چکا تھا۔ عثمانی شہنشاہی البتہ کچھ ٹھری ہوئی تھی مگر اسے

مصر اور عراق میں مقامی لوگوں۔ کے سامنے دستبردار ہونا پڑا تھا۔

ادھر ہندوستان میں تمام مسلمان حکمراں الگ الگ خانوں میں بٹ چکے تھے۔ نواب آصف الدولہ غیر متعصب شیعہ فرمانروا تھے۔ اور یہاں کی رعایا ان سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ خاص کر نواب کی دریادلی اور غرباء نوازی کے سبب ان کے لئے بے انتہا احترام عوام کے دل میں موجود تھا۔ ۱۷۸۴ء میں اودھ میں زبردست خشک سالی پڑ جانے کے سبب نواب نے ریاست میں پھیلی بے روزگاری کو دور کرنے کی غرض سے ایک وسیع و عریض امام باڑہ کی تعمیر شروع کی جس میں ہزاروں معمار رات دن کام کر کے سرکاری خزانے سے مزدوری حاصل کرتے رہے۔ دنیا کے سب سے وسیع و عریض حسینہ آصف الدولہ کے تعمیر ہو جانے کے بعد اس، کو بڑے امام باڑے کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

نواب نے عیش پرستی و سرور و مستی کا دامن چھوڑ کر مکمل طور سے دینی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی اور یہ امام باڑہ اسی بات کی غمّازی کرتا تھا۔

کول نے روٹس آف نارتھ انڈین شیعہ ازم میں نواب آصف الدولہ کے مذہبی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''۱۷۸۴ء میں محرم کے موقع پر تعزیہ کے جلوس میں نواب آصف الدولہ خود دریا تک شامل رہے اور وہ اتنی زور زور سے ماتم کر رہے تھے کہ ان کے سینے سے بے تحاشہ خون بہہ رہا تھا۔'' نواب آصف الدولہ ایک کھلے دماغ کے شیعہ حاکم تھے اور سنّی و شیعہ کا فرق کرنا ان کا طریقہ نہ تھا پھر بھی کئی مفاد برست طاقتیں ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلانے میں لگی ہوئی تھیں۔

بڑے امام باڑے کی تعمیر کے بعد جب وہاں امام حسین کی یاد میں مجلس غم کا اہتمام کیا گیا تو شہر کے دو مقتدر سنّی درباریوں خواجہ حاجی عبد اللہ اور میر عبد اللہ نے مجلس میں آنے سے انکار کیا ار کہا کہ ان کو خطرہ ہے کہ وہاں تبرہ بازی ہو گی۔ نواب آصف الدولہ نے ان دونوں حضرات کو ایک خط ارسال کیا جس میں لکھا تھا ''کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ امام حسین کی یاد میں منعقد ہونے والی مجلس میں کوئی درباری نہ آئے۔ یقین جانئے کہ صحابہ کو گالیاں دینے کا رواج ہمارے یہاں

نہیں ہے اور پھر آپ ناچ ورنگ کی محفلوں میں تو ہمارے ساتھ بیٹھ سکتے تھے مگر نواسۂ رسول امام حسین کی یاد میں منعقد ہونے والی مجلس میں آپ لوگ نہ آنے کے بہانے ڈھونڈھ رہے ہیں"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں شیعہ فرقہ کو پھلنے پھولنے کا بہت موقع ملا مگر سنیوں کے ساتھ بھی ایک ذرہ برابر ناانصافی نہیں کی گئی۔ شیعہ و سنّی حضرات باہم شیر و شکر ہو کر رہے تھے یہاں تک کہ بہت سے سنّی اور ہندو بھی امام حسین کی یاد میں تعزیہ داری کرنے لگے نواب آصف الدولہ کے عہد میں عزاداری کو اتنا فروغ ہوا کہ چھوٹے بڑے امام باڑوں کی تعداد دو ہزار اور تعزیہ خانوں کی تعداد چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۷۹۰ء میں مولانا دلدار علی نے بھی دریائی ٹولہ میں ایک امام باڑہ تعمیر کروایا جس کو اب حسینیۂ غفرانمآب کہا جاتا ہے اور یہاں ہر سال عالمی شہرت کی مجلس شام غریباں کا انعقاد ہوتا ہے جس کو آج کل مولانا کلب جواد خطاب کرتے ہیں ان سے قبل مولانا کلب عابد صاحب اور مولانا کلب حسین صاحب یہاں کی مجالس کو خطاب کرتے تھے۔

مولانا دلدار علی ایک انقلابی رہنما تھے انھوں نے شیعہ مذہب میں پھیلی بیجا رسوم کی سختی سے مخالفت کی اور توہم پرستی کا قلع قمع کیا۔ انھوں نے شیعوں میں نماز جمعہ پڑھنے کے لئے بیداری پیدا کی۔ اور لکھنؤ کے آصفی امام باڑہ کے صحن میں بنی وسیع و عریض مسجد میں نماز جمعہ کا خصوصی اہتمام کیا۔ انھوں نے ایک طرف نماز روزہ کی پابندی کے لئے شیعوں میں دینی جذبہ پیدا کیا تو محرم کے مراسم میں داخل ہو جانے والی بدعتوں اور غیر اسلامی چیزوں کو الگ کر کے محرم کے جلوسوں کو اسلامی شکل دی۔

نواب آصف الدولہ مولانا دلدار علی پر بہت مہربان تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے منھ بولے بیٹے اور جانشین میر وزیر کے ساتھ مولانا کی دختر نیک اختر کا نکاح کروادیں مگر مولانا نے خاندان شاہی سے ناطہ جوڑنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی صاحبزادی کا نکاح اپنے ایک غریب رشتے دار کے بیٹے سے بہت خاموشی سے کروادیا۔ وہ آصف الدولہ سے ذاتی فوائد اٹھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ قوم و ملت کو فائدہ پہنچانا چاہتے۔ نواب آصف الدولہ نے مولانا دلدار علی کی فرمائش پر عراق

کے شہر کربلا میں بہنے والی دریائے فرات سے نجف اشرف تک پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک نہر بنوائی جو ۱۸۹۳ میں بن کر تیار ہو گی جس سے کہ زائرین کو بہت سہولت ہو گئی۔ انھوں نے کربلا و نجف کے علماء کو بھی دو لاکھ روپئے بھجوائے تا کہ آئمہ کے روضوں کی دیکھ بھال بجا طور پر ہو سکے۔

وہابی تحریک

۱۸ ویں صدی کے اوائل میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں اپنے عروج پر تھیں جہاں وہ مسلمانوں کا ثقافتی استحصال کر رہے تھے تو کہیں سیاسی کہیں وہ امت مسلمہ میں مسلکی اختلافات کو ہوا دے رہے تھے تو کہیں وہ لسانی و قبائلی جھگڑوں میں مسلمانوں کو الجھا کر اسلام کو نابود کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان سب سازشوں میں سب سے بڑی سازش یہ تھی کہ مسلمانوں میں نئے فرقوں کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔

برطانیہ کے بدنام زمانہ جاسوس ہمفرے کی ڈائری جرمنوں کے ہاتھ لگ گئی تھی جس کو ان لوگوں نے قسط وار شائع کر کے برطانیہ کے اسلام مخالف رویہ کا بھید کھول دیا تھا بعد میں ان صفحات کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا اور اب یہ کتاب ہمفرے کے اعترافات کے نام سے اردو میں بھی چھپ کر آگئی ہے۔ COLONIZATION IDEAL کے نام سے تحریر شدہ یادداشت میں برطانوی جاسوس HUMPHREY نے جابجا ان جلسوں اور خفیہ میٹنگوں کا ذکر کیا ہے جس میں مختلف عیسائی ممالک کے رہنما ایک جگہ بیٹھ کر اسلام کو تباہ کرنے کی سازش رچتے تھے۔ ان میٹنگوں میں طے ہونے والے منصوبوں کا ایک اقتباس ہمفرے نے یوں تحریر کیا ہے۔ ”عیسائی مذہب اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ساری دنیا اس کے قبضہ میں آجائے۔ حضرت عیسٰی نے اپنے سچے پیرو کاروں کو اسی جہانگیری کی بشارت دی ہے۔“ ہمفرے نے لندن کے ایک مشہور پادری کے وہ جملے بھی تحریر کئے ہیں جو اس نے مختلف ممالک کے عیسائی کی ایجنٹوں کی ایک خفیہ میٹنگ میں کہے تھے ”آپ لوگ ہمتیں پست نہ کریں صبر و حوصلہ سے کام لیں عیسائیت تین سال

کی زحمتوں اور دربدری کے ساتھ حضرت عیسیٰ اور ان کے پیروکاروں کی شہادت کے بعد عالمگیر ہوئی ہے ممکن ہے آئندہ حضرت عیسیٰ کی نظر ہم پر ہو اور ہم تین سو سال بعد کافروں کو نکالنے میں کامیاب ہوں۔ پس ہم پر لازم ہے کہ اپنے آپ کو محکم ایمان اور پائدار صبر سے منرین کریں اور ان تمام وسائل کو بروئے کار لائیں جو مسلمان خطوں میں عیسائیت کی ترویج کا سبب ہوں اگر اس میں ہمیں صدیوں کا عرصہ بھی گزر جائے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں آباء واجداد اپنی اولادوں کے لئے ہی بیج بوتے ہیں۔" ہمفرے لکھتا ہے "۱۷۱۰ء میں انگلستان کی نو آبادیاتی علاقوں کی وزارت نے مجھے مصر، عراق، ایران، حجاز اور عثمانی خلافت کے مرکز استنبول کی جاسوسی پر مامور کیا۔ مجھے ان علاقوں میں وہ راہیں تلاش کرنا تھیں جن سے مسلمانوں کو درہم برہم کر کے مسلم ممالک میں سامراجی نظام رائج کیا جاسکے"۔

ہمفرے اور اس کے جیسے سینکڑوں جاسوسوں کو اس بات کی اچھی طرح تربیت دی گئی تھی کہ کسی بھی انسانی سماج کو بانٹنے کے لئے مندرجہ ذیل پانچ حربوں میں سے کسی کو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ نسلی اختلافات

۲۔ قبائلی اختلافات

۳۔ ارضی اختلافات

۴۔ قومی اختلافات

۵۔ مذہبی اختلافات

اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے انھوں نے ہر مسلم ملک میں انھیں ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ اور ان اختلافات کو بھڑکانے کے لئے برطانوی جاسوسوں کے پاس بہت ہی گھناؤنے منصوبے تھے۔ جس کے تحت شیعہ سنّی اختلافات کو فساد کی شکل دیتا۔ نوجوانوں کو دین سے منحرف کرنا۔ مسلمانوں کی بستیوں کو تاراج کروانا۔ دین کے معاملہ میں ان کے دماغوں میں شک پیدا کرنا۔ عربی و عجمی و ہندی و ترکی و حبشی نسلوں کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کو آپس میں بانٹنا نئے

گروہوں کی داغبیل ڈالنا۔ انقلابی تحریکوں کے نام پر مسلمانوں میں نئے نئے فرقوں کو جنم دینا۔ برطانوی جاسوس ہزاروں کی تعداد میں دنیا بھر میں پھیل کر اسی کام کی انجام دہی میں لگ گئے۔ اور انھوں نے ایک طرف ایران میں بہاءاللہ کے خیالات کو نئے مذہب کی شکل دی تو دوسری طرف ہندوستان میں غلام احمد قادیان کو ایک نیا اسلامی فرقہ لیکر میدان میں اتارا تو سوڈان میں مہدیت کا فتنہ کھڑا کیا مگر ان سب فتنوں میں سب سے طاقتور اور خطرناک فتنہ ہمفرے کی ہی دریافت تھا۔ یعنی محمد بن عبد الوہاب۔ ہمفرے نے اپنی یادداشتوں میں محمد بن عبدالوہاب کے مذہبی عقائد و خیالات کا ذکر بہت تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور اس نے کسی طرح ایک سادہ لوح مسلمان کو ایک اوباش اور مغرور مسلمان بنا کر اسلام کی تباہی و بربادی پر مامور کیا اس کا بھی پوری تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے۔

۱۷۴۴ء کے آس پاس برطانوی حکومت کے اشارہ پر شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اپنے نئے دین کا اعلان کر دیا۔ ابتداء میں صرف خاص خاص لوگوں کو بلا کر بہت ہی غیر مبہم الفاظ اور اختصار کے ساتھ اس مہم کا آغاز ہوا اور بظاہر اس کا نعرہ شرک و بدعت کو مٹانا اور اللہ کی عبادت کے کام کو آگے بڑھانا تھا۔ موحدون کے نام سے وجود میں آیا ہوا یہ فرقہ آہستہ آہستہ پیسہ کے بل بوتے پر آگے بڑھتا رہا ہے جب یہ تحریک دور دور تک پھیل گئی تو برطانوی حکومت نے ہمفرے کو مطلع کیا کہ اب سیاسی اعتبار سے بھی جزیرۃ العرب میں کوئی کام ہونا چاہئے۔

اس کام کے لئے اس نے اپنے ایجنٹوں کو محمد بن سعود کے پاس بھیجا تاکہ وہ محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ اشتراک کرے۔ برطانوی حکومت ان محمدین کے آپسی اشتراک کے ذریعہ مسلمانوں کی بربادی و تباہی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ برطانوی سازش کے مطابق سیاسی امور کی ذمہ داری محمد بن سعود کو اور مذہبی معاملات کے فیصلے کلی طور پر محمد بن عبدالوہاب کے دائرہ اختیار میں دینے کی بات شامل تھی ڈیوڈ ہولٹن نے اپنی کتاب ''دی ہاؤس آف سعود'' میں لکھا ہے ''عبدالوہاب ایک قدامت پسند مسلمان تھا اور وہ عربستان میں پھیلی اصطبل کی جیسی بدبو کو ایک بار پھر اللہ کے نام پر دور کرنے آیا تھا۔ لیکن فقط اللہ کا نام اس کام کے لئے کافی نہ تھا۔ عبدالوہاب کو

بھی پیغمبر حضرت محمد کی طرح ایک تلوار کی ضرورت تھی اور اس کو محمد بن سعود اور اس کے خانوادہ کی شکل میں یہ تحفہ مل ہی گیا۔"

(ڈیوڈ ہولٹن نے دراصل ان جملوں کے ذریعہ ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں اول تو اس نے محمد بن عبدالوہاب کو پیغمبر حضرت محمدؐ (معاذاللہ) کا ہم وزن قرار دینے کی کوشش کی اور دوسری طرف عیسائیوں کے اس پروپگینڈہ کی بھی تائد کی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔)

محمد بن سعود کی تلوار اور محمد بن عبدالوہاب کی موحدون تحریک ویسے تو تمام مسلمانوں کے خلاف تھی لیکن ان لوگوں نے اپنے نشانہ کو ذرا ترچھا کر کے شیعوں کی طرف کر دیا۔ اٹھارویں صدی کی ابتداء تک وہابی تحریک اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ۱۸۰۴ء میں وہابی فوجوں نے کربلا و نجف کے مقامات مقدس پر حملہ کر کے وہاں بڑے پیمانے پر تباہی مچائی۔ (لکھنؤ کے حکیم مرزا بچھو جو نواب برہان الملک کی میّت کو لے کر کربلائے معلیٰ گئے تھے اور وہیں رہ رہے تھے اس حملہ میں قتل کر دئے گئے اور آصف الدولہ کی نبوائی ہوئی نہر آصفی کو بھی وہابی حملہ آوروں نے تباہ کر دیا)

ان حملوں کے بعد وہابیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور وہ ترکی کی عثمانی سلطنت کے لئے خطرہ بنے لگے۔ ۱۸۱۱ء میں ترکی کے سلطان کے حکم پر مصر کے گورنر محمد علی نے وہابیوں کے خلاف سخت اقدامات کرنا شروع کر دئے اور تقریباً سات برس تک وہ وہابیوں کے خلاف صف آرا رہا لیکن برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ مگر محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے ۱۸۱۸ء میں وہابیوں کے خلاف چل رہی مہم میں کامیابی حاصل کر لی اور نہ یہ کہ صرف مقدس شہر مکہ کو وہابیوں کے قبضہ سے آزاد کیا بلکہ نجد کے اطرف میں ۵۰۰ میل اندر تک گھس کر قبضہ کر لیا اور وہابیوں کو جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

اودھ کے عوام وہابی تحریک سے بڑی حد تک بے بہرہ تھے اور ذرائع ابلاغ کا فقدان ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو وہاں کی درست اطلاعات نہیں تھیں۔ اس لئے حکیم بچھو کے قتل

اور نہر آصفی کو توڑے جانے کے واقعات پر بھی کوئی بڑا احتجاجی مظاہرہ یا جلسہ نہ ہوا۔ اور یہ بے خبری بھی ایک اچھی بات ہی رہی ورنہ شائد انگریزوں کو اور زیادہ جلدی شیعہ سنّی اختلاف کو فساد کی شکل دینے میں کامیابی مل جاتی۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ اودھ کی شیعہ سلطنت کے قیام میں یہاں کے سنّی شیخ زادوں کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اور شاید اسی کا احترام کرتے ہوئے شیعہ فرمان رواؤں نے یہاں کے سنّی عوام کو بھرپور اختیارات سے نوازا۔

اس کے علاوہ خود علمائے فرنگی محل اور مولانا دلدار علی کے درمیان کافی اچھے روابط ہونے کی وجہ سے شیعہ سنّی فرقوں کے مابین تناؤ نہیں تھا۔ کول نے "روٹس آف نارتھن انڈین شیعہ ازم"۔ میں تحریر کیا ہے "شیعہ فرقہ سنّی فرقہ کے لئے بہت احترام دکھاتا تھا۔ مولانا نصیر آبادی (سید دلدار علی) فرنگی محل کے قریب (جوہری محلّہ میں) رہتے تھے فرنگی محل سنّی فرقہ کی بہت بڑی درسگاہ تھی اور جہاں شیعہ فرقہ کے طلباء بڑی تعداد میں حصول علم کے لئے جایا کرتے تھے۔ کول نے آگے لکھا ہے کہ "مولانا نصیر آبادی (دلدار علی غرانماب) ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ اودھ میں سنّی فرقہ کو وہ سب ہی حقوق ملنا چاہئے جو کہ ایک عام شیعہ کو حاصل ہوتے ہیں وہ شیعہ سنّی کے بیچ تفریق کئے جانے کے بھی سختی سے مخالف تھے۔"

۱۷۹۸ء نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے منھ بولے بیٹے نواب وزیر کو مسند نشینی کا شرف ملا نواب وزیر نے شجاع الدولہ کی شکست کے بعد انگریزوں کو جو اقتدار حاصل ہوا تھا اس کو کم کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کو بیچ سمجھا تو بیچارہ کو معزول ہو کر ساری زندگی قید و بند میں گزرنا پڑی اور ان کے چار مہینہ بعد نواب سعادت علی خاں نے گدی سنبھالی۔ نواب سعادت علی خاں سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے بعد میں صحتیاب ہونے پر انہوں نے لکھنؤ کے رستم نگر علاقہ میں اس جگہ پر ایک شاندار روضہ تعمیر کروایا جہاں پر ایک فقیر نے ایک علم نصب کر رکھا تھا اور اس علم کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ یہ وہی علم ہے جو عاشور کے دن حضرت عباس کے ہاتھوں میں تھا۔ فقیر کا کہنا تھا کہ اس کو بشارت کے بعد فرات کے کنارے ریت میں یہ علم دبا ہوا ملا تھا۔ نواب سعادت علی خاں نے اس علم کے چاروں طرف بلڈنگ

بنوادی۔ نواب سعادت علی خاں کے تعمیر کردہ اس روضہ کو درگاہ حضرت عباس کے نام سے یاد کیا
جاتا ہے۔ وہاں ہر ماہ کی نوچندی میں ماتم و مجالس کا اہتمام ہونا شروع ہوا اور شہر کے مختلف حصوں
سے علم کے جلوس اٹھ کر وہاں تک جانے لگے۔ درگاہ حضرت عباس کی تعمیر کے علاوہ انھوں نے
امام حسین کے غم کو بارہ دن سے بڑھا کر چالیس دن کرنے کا اعلان بھی کیا۔ نواب سعادت علی
خاں کے عہد سے قبل کچھ تعزیوں کو دریا میں تیرانے کا رواج تھا اور کچھ تعزیہ تالاب سپہ میں
تیرائے جاتے تھے۔ مگر نواب موصوف کی مصلحت سے نواب قاسم علی خاں نے تال کٹورہ میں
تعزیہ دفن کرنے کا اہتمام کیا نواب قاسم علی نے زمین کے چاروں طرف لکڑی کا جنگلہ نصب کر
کے ایک چبوترہ تعمیر کیا اور اس میں تعزیہ دفن کئے جانے لگے۔ اس طرح چہلم امام حسین تک
عزاداری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تعزیہ جہاں پر دفن ہوتے تھے وہاں پر حاجی مستیا داروغۂ تعمیرات
کی زیر نگرانی ایک روضہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ (اب یہ کربلا منہدم ہو چکی ہے اور اس کو حاجی مستیا
کی کربلا کہا جاتا ہے)۔

نواب سعادت علی خاں کے دربار میں ایسے ناعاقبت اندیش لوگ موجود تھے جو شیعہ
سنّی تنازعہ کو ہوا دے کر اسلامی اتحاد کو بکھیر دینا چاہتے تھے نواب سعادت علی خاں کے عہد میں
(۱۸۹۱ء میں) مولانا شاہ عبدالرحمٰن نامی ایک صوفی بزرگ لکھنؤ میں وارد ہوئے۔ ابتداء میں تین
روز تک شاہ پیر محمد قادری کے مزار (ٹیلہ والی مسجد) پر گزارے اور پھر درگاہ حضرت شاہ میناشاہ کی
مسجد میں قیام کیا۔ ایک دن موصوف نے نواب سعادت علی خاں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو
کسی درباری نے کہا کہ آپ کا نام تو حضرت علی کے قاتل (عبدالرحمٰن بن ملجم) کے نام پر ہے
اس لئے نواب آپ سے کیوں کر ملنا پسند کریں گے؟ اس پر موصوف نے جواب دیا کہ تمہارے
آقا مولا نے تو اسی عبدالرحمٰن بن ملجم کو ضربت لگانے کے بعد بھی دودھ پلوایا اور تم صرف اس
نام کے آدمی سے اتنی نفرت کا اظہار کر کے کیا اپنے آقا مولا کی سیرت پر چل رہے ہو؟ اس
جواب کی کسی کو توقع نہ تھی اور سب لاجواب ہو گئے۔ مگر شاہ صاحب نے نواب سے ملاقات کا
خیال ترک کر دیا اور شاہ میناشاہ کی درگاہ تک قیام کرنے کے بعد وہ مسجد پنڈائن کے نام سے مشہور

ایک شکستہ مسجد میں منتقل ہو گئے اور عمر کا باقی حصہ یہیں رہ کر گزارا۔

غازی الدین حیدر اول شاہ اودھ

نواب سعادت علی خاں کے بعد ۱۸۱۷ء میں ان کے بیٹے غازی الدین حیدر کو عنانِ حکومت سنبھالنے کا موقع ملا۔ غازی الدین حیدر نے ٹوٹتی اور بکھرتی ہوئی مغل سلطنت سے اپنا ناطہ توڑ کر خود کو اودھ کا شاہ قرار دے دیا۔ یقیناً اس میں ریزیڈنٹ بہادر کی خوشی شامل تھی کیوں کہ وہ تو اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے منصوبے لیکر ہی یہاں آئے تھے۔ بظاہر انگریز غازی الدین حیدر کے دوست تھے لیکن در حقیقت وہ صرف اس بات کے منتظر تھے کہ ان لوگوں کو کس طرح مزید بدنام کیا جائے اور حکومت ہڑپ لی جائے۔

غازی الدین حیدر کو عمارتوں کا بہت زیادہ شوق تھا۔ ان کے زمانے میں تبصرہ سعادت علی خاں، شاہ نجف کربلائے تالکٹورہ سمیت بہت سی خوبصورت عمارتیں بن کر تیار ہوئیں۔ انھوں نے اپنی ریاست میں اپنے مردہ شوہر کی چتا پر زندہ بیٹھ کر جل جانے کی رسم ستی کو ممنوع قرار دے کر ایک انقلابی کام کیا اور مردوں کو ہجڑہ بنائے جانے کی رسم بھی پابندی عائد کی۔

غازی الدین حیدر کے دور میں شیعہ سنّی معاملات نے کافی رنگ پکڑا اور کئی بار فساد کی نوبت آگئی۔ بالخصوص ۱۸۱۹ء میں ان کو شیعہ سنّی جھگڑے سے نبٹنے کے لئے سخت اقدامات کرنا پڑے۔

۸ محرم ۱۲۳۵ھ مطابق ۲۷/اکتوبر ۱۸۱۹ء کو لکھنو میں شیعہ سنّی فساد ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب وزیر کی شادی میں عہد آصف الدولہ میں کشمیر سے بہت سے شرکاء آئے تھے اور انہوں نے بعد میں یہیں بس جانے کا فیصلہ کیا۔ اور شیعہ کشمیریوں نے مقبرہ عالیہ گولا گنج کے علاقہ میں اور ہندو کشمیریوں نے رستم نگر کے پاس اپنی بستیاں آباد کیں (اس محلّہ کو اب کشمیری محلّہ) کہا جاتا ہے۔

پاٹانالہ کے علاقہ سے آٹھ محرم کو انھیں کشمیریوں کا جلوس نکل رہا تھا تو اس میں پڑھے جا رہے نوحہ کے ایک مصرعہ پر سنّیوں نے اعتراض کیا۔ اس مصرعہ میں شیعوں کے مطابق یزید پر لعن کی گئی تھی جب کہ سنّیوں کو کہنا تھا امیر معاویہ پر لعن کی جا رہی ہے۔

کشمیریوں کے علم پر چھتوں سے پتھر پھینکے گئے جس سے افراتفری مچ گئی اور فساد ہو گیا اس فساد میں کئی لوگ مارے گئے باورچی ٹولہ کی جس مسجد میں شاہ عبدالرحمٰن قیام پذیر تھے اس کا دروازہ کیننگ اسٹریٹ (سبھاش مارگ) کی طرف کھلتا تھا۔ پاٹے نالہ کے تنگ راستے پر پتھراؤ کے بعد ادھر ادھر بھاگنے والی بھیڑ نے اس مسجد پر بھی حملہ کر دیا۔ کھل کر تیغ و تبر کا استعمال ہوا۔ لیکن مسجد میں پناہ لئے ہوئے حضرات بچ گئے اور خود شاہ عبدالرحمٰن کا بال بھی بانکا نہ ہوا البتہ ان کے کئی مرید جو مسجد سے نکل کر باہر آ گئے تھے اس فساد میں مارے گئے۔

نواب غازی الدین حیدر کی اہلیہ بادشاہ بیگم اس واقعہ سے بہت دل برداشتہ ہوئیں انھوں نے شاہ عبدالرحمٰن سے نہ صرف اظہار افسوس کیا بلکہ معافی بھی مانگی بادشاہ بیگم نے شاہ عبدالرحمٰن کی جائے قیام بن جانے والی اس مسجد کی ازسر نو تعمیر کا حکم دیا۔ جس کے دونوں دالان ۱۸۲۳ء میں بن کر تیار ہوئے۔ ادھر تو لکھنؤ میں ۱۸۱۹ء میں یہ ہنگامہ آرائی ہوئی اور دوسری طرف آٹھ محرم کو ہی اسی سال ضلع رائے بریلی کے قصبہ نصیر آباد میں بھی مولانا سید احمد اور ان کے ساتھیوں نے شیعوں کا محاصرہ کر رکھا تھا (اس کا ذکر آگے کے صفحات پر تفصیل سے آئے گا)۔ نواب غازی الدین حیدر خود ایک کٹر شیعہ تھے اور ان کی اہلیہ بادشاہ بیگم اس معاملہ میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔

"بادشاہ بیگم نے محل سرا میں آئمہ معصومین کے روضوں کی نقل تعمیر کروائی تھی اور حضرت عباس کی کربلا تیار کر کے شب و روز مراسم تعزیت ادا کرتی تھیں"

شاہ غازی الدین کے زمانے میں ان کے وزیر آعظم نواب معتمد الدولہ آغا میر نے ایک شاندار امام باڑہ ڈیوڑھی آغا میر میں بنوایا تھا (جس کو انگریزوں نے بعد میں جبلی کالج بنا دیا) اور نرئی کا علاقہ میں کربلا آغا میر بھی تعمیر کروائی جس میں تعزیہ دفن کئے جاتے تھے۔ (اب یہ کربلا

پارسیوں کی انجمن کے قبضہ میں ہے اور اہل محلّہ اس کو جادو گھر کے نام سے پکارتے ہیں)۔ اس زمانے میں شیعت کے فروغ کے لئے کافی روپیہ خرچ کیا جا رہا تھا لیکن دوسرے فرقوں کے مذہبی امور پر بھی سرکاری خزانے سے وافر رقمیں خرچ کی جارہی تھیں۔ اور عوام کی دقتوں کو دور کرنے کی بھی کوشش ہو رہی تھیں۔

شاہ غازی الدین نے اپنی ہندو رعایا کی فرمائش پر اناؤ اور کانپور کے بیچ بہنے والی گنگا ندی کو ایک نہر کے ذریعہ لکھنؤ تک لانے کا ایک جامع منصوبہ بھی بنوایا۔ چھ لاکھ روپئے کی لاگت سے تیار ہونے والی اس نہر کو اناؤ سے لکھنؤ تک کھود بھی دیا گیا۔ راستے میں کئی پل بھی بنائے گئے مگر لکھنؤ کی سطح اناؤ کے مقابلہ میں اونچی ہونے کے سبب اس میں کامیابی نہ ملی۔ اس وقت کے انجینیروں کے ناکامی پر شاہ غازی الدین نے صرف ایک جملہ کہا کہ میں نے یہ رقم گنگا جی کی نذر کی ۔ آج بھی نہر غازی الدین حیدر شہر کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی گومتی تک جاتی دکھائی دیتی ہے لیکن ہندو مسلم اتحاد کی علامت یہ نہر اب ایک گندہ نالہ میں تبدیل ہو چکی ہے۔

غازی الدین حیدر کا عہد امام حسین کی عزاداری کے عروج کا زمانہ تھا اور لکھنؤ کے قدیم باشندہ اس میں تن من دھن سے لگے ہوئے تھے مگر لکھنو میں آباد قندھاری پٹھانوں کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا اور وہ لوگ درگاہ حضرت عباس کی طرف آنے جانے والے عزاداروں کو پریشان کرتے تھے۔

شاہ غازی الدین حیدر قندھاری پٹھانوں کی اس حرکت سے بہت پریشان تھے انھوں نے محبت علی خاں قندھاری کے بیٹوں کو بلا کر بہت سمجھایا اور ایسی حرکتوں سے باز رہنے کو کہا مگر وہ لوگ نہ مانے تو مجبوراً شاہ غازی الدین نے ان لوگوں کو رستم نگر کے راستے سے ہٹا کر وزیر باغ میں لے جاکر آباد کیا اور درگاہ کے باہر سڑک پر ایک بڑا سا دروازہ بنوا کر اس پر توپ نصب کروادی تاکہ ان لوگوں کے حملوں سے نبٹا جا سکے گو کہ شاہ کے وزیر آعظم معتمد الدولہ نے اس کی مخالفت بھی کی کیونکہ اس سے شیعہ سنّی تناؤ بڑھنے کا امکان تھا مگر بادشاہ کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ (توپ دروازہ کے نام سے درگاہ کے پاس ایک محلّہ آج بھی موجود ہے مگر وہ دروازہ اور

توپ پہلی جنگ آزادی میں تباہ ہو گئے)۔

انگریزوں کے پیر تو اودھ میں جم ہی چکے تھے اور ان کو یہاں برپا ہونے والی ہر شورش میں دلچسپی تھی اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قندھاری پٹھانوں کو انگریزی حکمران اپنا آلہ کار بنا رہے تھے۔ اس وقت کے حالات کچھ اتنے نازک ہو چکے تھے کہ تالکٹورہ میں زیر تعمیر کربلا کی حفاظت کے لئے حسینی پلٹن نام کا ایک فوجی دستہ بھی تشکیل دیا گیا۔ اس روضہ کو میر خدا بخش کی کربلا کے نام سے جانا جاتا ہے۔

غازی الدین حیدر کے عہد میں اودھ بھی وہابی تحریک کے طرز پر مولانا سید احمد رائے بریلوی نے ایک تحریک شروع کی مگر ان کی تحریک سنّی فرقہ میں پھیلی بدعتوں کے خلاف نہ ہو کر صرف شیعہ فرقہ کے خلاف تھی انھوں نے شیعوں کے خلاف اعلان جہاد کر رکھا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ۱۸۱۹ء میں مولانا سید احمد کی شہ پر رائے بریلی ضلع کے قصبۂ نصیر آباد میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہاں آٹھ محرم کی مجلس چل رہی تھی اور کسی نے مولانا سید احمد کو یہ خبر پہنچائی کہ شیعہ حضرات تبرہ بازی کر رہے ہیں۔ سید احمد نے شیعوں کو مزہ چکھانے کے لئے رائے بریلی کے سنّیوں اور جلال آباد کے افغان پٹھانوں کی فوج لیکر نصیر آباد کا محاصرہ کر لیا۔

غازی الدین حیدر نے لکھنؤ سے مدد کے لئے فوج بھیجی اور اس کی قیادت شاہ نے سنّی کمانڈروں کے ہاتھ میں دے دی تاکہ سید احمد کا منصوبہ کامیاب نہ ہونے پائے۔ نصیر آباد کے قریب پہنچ کر غازی الدین حیدر کے وزیر اعلیٰ معتمد الدولہ نے بہت دانشمندی سے کام لیتے ہوئے معاملہ کو سنبھال لیا۔ انھوں نے مولانا سید احمد سے اصرار کیا کہ وہ مذہبی معاملات کو میدان جنگ میں طے کرنے کے بجائے اگر گفتگو اور مناظرہ اختیار کریں تو بہتر ہو گا۔

مولانا سید احمد لکھنؤ آئے اور یہاں مولانا دلاور علی صاحب کے شاگردوں اور صاجزادہ مولانا سید محمد سے مناظرہ کیا مگر نہ تو وہ نظریاتی طور پر لکھنو کے سنّیوں کو اپنے ساتھ کر سکے اور نہ ہی شیعوں کو مات دے سکے ناامید ہو کر انھوں نے اپنے سات سو ساتھیوں کے ساتھ مکہ و مدینہ کا

رخ کیا۔ عرب میں ان کی ملاقات کئی وہابی علماء سے ہوئی اور وہ اس عزم کے ساتھ ہندوستان واپس ہوئے کہ وہ اودھ کے شیعوں کو تعزیہ داری (جو ان کی نظر میں بت پرستی تھی) سے روک کر ہی دم لینگے ورنہ ان کا کام تمام کر دینگے۔ سید احمد کے ارادوں کی خبر غازی الدین حیدر کو ملی تو انھوں نے ریزیڈنٹ کو مطلع کیا مگر ریزیڈنٹ نے اودھ کے حکمراں کی کوئی مدد نہیں کی۔

مگر مولانا سید احمد رائے بریلوی نے اودھ واپس آنے کے بعد قتل و غارت گری اختیار کرنے کے بجائے خاموشی سے وہابی تحریک کی تبلیغ شروع کر دی اور شاہ غازی الدین نے بھی نہ تو انھیں گرفتار کیا نہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر روک لگائی۔ بہت کوشش کے باوجود لکھنؤ کے سنّی بھی سید احمد رائے بریلی کے خیالات سے متفق نہیں ہوئے ۱۸۲۶ء میں انھوں نے ناکام ہو کر پیشاور جانے کا فیصلہ کیا۔ پیشاور میں ان دنوں شیعوں کے استحصال کا دور دورہ تھا۔ تعزیہ داری ممنوع تھی محرم کے مراسم پر پابندی تھی یہاں تک کہ اپنے کو شیعہ کہنے کی جسارت کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ سید احمد رائے بریلوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پیشاور جا کر مزید افغانی فوجیوں کو لا کر اودھ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے مگر پیشاور پہنچنے کے بعد انھیں کشمیر اور پنجاب کے علاقوں میں کئی معرکہ آرائیوں میں شامل ہونا پڑا اور آخر کار ۱۸۳۱ء میں کشمیر میں پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے کے فوجی دستہ کا ساتھ معرکہ آرائی میں مولانا سید احمد اور ان کے چار سو ساتھی قتل کر دیے گئے۔

۱۸۲۹ء میں لکھنؤ کے مکارم نگر کی کربلا میں بھی شیعوں اور سنّیوں کے مابین تعزیہ دفن کرنے کے معاملہ کو لے کر جھگڑے نے فساد کا رخ اختیار کیا اور کئی لوگوں کی جان تلف ہوئی۔ ہوا یوں کہ میواتی ذات کے ایک سنّی نے تعزیہ دفن کرنے پر مباحثہ کے بعد ایک شیعہ کو گولی مار دی وہاں موجود بھیڑ نے اس میواتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ تب میواتیوں کی ایک بھیڑ نے شیعوں پر حملہ کر کے کئی لوگوں کو جان سے مار دیا۔ تب سرکار نے مداخلت کی اور حکومت کے سپاہی فسادیوں کو پکڑنے کے لئے پہنچے تو فسادی بھاگ کر برٹش سرکار کے علاقہ میں چلے گئے۔

نصیر الدین حیدر اور علماء سے ٹکراؤ

بادشاہ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ بادشاہ بیگم نے یہ حکم جاری کیا کہ تمام ساکنان سلطنت سیہ پوشی اور عزاداری کی رسم عمل میں لائیں اور چالیسویں تک بیاہ و نکاح اور دیگر لوازم شادی کو ترک کریں ورنہ سزا ہوگی۔ ظاہر ہے یہ حکم سنّی اور ہندو رعایا کے لئے ناگواری کا سبب بنا اور ریزیڈنٹ نے بھی اس پر ناراضگی کا اظہار کیا مگر بادشاہ بیگم شیعت کے معاملہ میں اعتدال پر نہ تھیں اس لئے ان کی طرف سے ایسے حکم کا جاری ہونا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی غازی الدین حیدر اپنے بیٹے نصیر الدین حیدر کے واطوار سے اتنا تنگ تھے کہ وہ نصیر الدین حیدر کو اپنا جانشین بنانا نہیں چاہتے تھے مگر غازی الدین کہ انتقال کہ بعد نصیر الدین حیدر ہی کو مسند نشینی کا شرف ملا انھیں بھی اپنے باپ کی طرح عمارتیں بنوانے کا شوق تھا چھتر منزل اور تارہ والی کوٹھی سمیت مختلف عمارتوں کی تعمیر انھوں نے کروائی۔ انھوں نے شیعہ مذہب میں بدعتیں اور غیر اسلامی رسوم کو شامل کرنے کا عجیب و غریب طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ اسلامی اصولوں اور دین محمدی سے کھواڑ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھوں نے ایک شادی شدہ عورت سے بیاہ رچانا چاہا، دوا کے نام پر شراب کو جائز کروانا چاہا۔ یہاں تک کہ انھوں نے جنم اشٹمی کے طرز پر شیعوں کے بارہ اماموں کا زچہ خانہ تک قائم جانے کی روایت قائم کردی تھی۔ مولانا دلدار علی غفرانماب کے صاحبزادہ مولانا سید محمد جن کو سلطان العلماء کے لقب سے پکارا جاتا تھا بادشاہ کی غیر اسلامی حرکتوں سے بہت خفا تھے اور بادشاہ کے کسی بھی غیر شرعی فعل کو شرعی فعل کی چھٹ دینے پر راضی نہ تھے۔

بادشاہ اور سلطان العلماء کے بیچ زبردست تناؤ پیدا ہو گیا تھا بادشاہ نے سلطان العلماء کو ذلیل کرنے کی نیت سے دربار میں طلب کیا اور دربار میں صرف دو کرسیاں رکھیں ایک پر قلم دوات رکھ دئے اور دوسری پر خود بیٹھ کر سلطان العلماء کی راہ دیکھنے لگا۔ سلطان العلماء کے داخل ہوتے ہی بادشاہ پر ایسا رعب و دبدبہ چھایا کہ بادشاہ خود ہی ادب سے کھڑا ہو گیا۔ سلطان العلماء قلم

وسیا ہی ہاتھ میں اٹھا کر کرسی پر بیٹھ گئے دوبارہ پھر بادشاہ نے مولانا کو دربار میں طلب کیا لیکن اس بار مولانا نے شاہی بلاوے کو ٹھکرا دیا بادشاہ نے برافروختہ ہو کر حکم دیا کہ سلطان العلماء کا گھر توپ سے اڑا دیا جائے۔ شہر میں کھلبلی مچ گئی کئی لوگ اور درباری سلطان العلماء کے پاس آئے اور کہا کہ بادشاہ سے معافی مانگ لیجئے۔ مگر مولانا نے ایک نہ سنی۔ شاہی فوج کے کپتان مقبول الدولہ نے دو توپیں توپ خانے سے نکلوائیں اور ایک کا منھ شاہی محل چھتر منزل اور دوسرے کا جوہری محلّہ کی طرف کر دیا۔ بادشاہ کو جب اس کی خبر ملی تو وہ پریشان ہو گیا اس نے مقبول الدولہ کو بلا کر پوچھا کہ شاہی محل کی طرف توپ کا رخ کیوں کیا گیا ہے؟ تو مقبول الدولہ نے کہا میں نہیں چاہتا کہ "سلطان دین کا گھر تو اجڑ جائے لیکن سلطان دنیا کا گھر رہ جائے؟ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج میں اپنے دین و دنیا دونوں کا خاتمہ کر دوں گا۔"

نصیر الدین حیدر نے غالباً سلطان العلماء کو دھمکانے کے لئے توپ چڑھوائی تھی یا پھر شاہی فوج کی بغاوت کے خوف سے انھوں نے دھمکی واپس لے کر مقبول الدولہ کو نہ صرف سراہا بلکہ انعام و اکرام سے نوازا۔ لیکن مولانا سید محمد صاحب اور بادشاہ کے بیچ تعلقات زندگی بھر استوار نہ ہو سکے۔ مگر سلطان العلماء نے بادشاہ کی شروع کی ہوئی بدعتوں کی سختی سے مخالفت کر کے انھیں عوام میں پنپنے نہیں دیا اور شیعیت کا چہرا بگاڑنے والی احمقانہ حرکتوں کی روک تھام بہت مستعدی اور ہمت کی ساتھ کی۔ شاہ نصیر الدین گومتی پار کے علاقہ میں ایک غار بھی بنوایا جس کو بارہویں امام کا غار قرار دیا۔ پندرہ شعبان کے موقع پر لوگ اس غار کے چاروں طرف نذر و نیاز کے لئے جمع ہونے لگے یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور لوگوں کی یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ یہاں عریضہ ڈالنے سے حاجات پوری ہو جاتی ہیں۔ اس زمانہ میں ایک طرف تو شیعت کے فروغ کے لئے لاکھوں روپئے خرچ کئے جا رہے تھے اور نئی نئی رسموں کو شیعہ مذہب میں جوڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی وہیں دوسری طرف کچھ سنّی علماء بھی شیعوں کے خلاف میدان میں اتر چکے تھے۔ خود شیعہ علماء تو بادشاہ سے ناراض تھے ہی کہ سنّیوں کے کچھ علماء بھی اس صورتحال کا فائدہ اٹھا نے کے لئے میدان میں آگئے۔

۱۸۳۳ء میں دہلی سے لکھنؤ آکر بسنے والے ایک مشہور سنّی عالم مرزا احمد فاروقی نے جمعہ کے خطبہ میں جب شہادت امام حسین کا ذکر بہت پر اثر الفاظ میں کہا تو دہلی کے اک نقشبندی عالم دین رشید الدین دہلوی نے اس کی اطلاع پاتے ہی مولانا مرزا احمد فاروقی کو ہدایت دی کہ وہ خطبۂ جمعہ میں امام حسین کی شہادت کا ذکر نہ کریں کیوں کہ سنّی فرقہ کے عقائد کے بموجب امام حسین کا شہید ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔ اس فتویٰ کی خبر جب شیعوں کو ملی تو شہر میں ہنگامہ مچ گیا لیکن اس تناؤ اور کشیدگی کو کم کرنے کے لئے مولانا سید محمد نصیر آبادی نے عوام کو سمجھایا بجھایا اور دوسرے سنّی علماء کی رائے جاننے کا وعدہ کر کے معاملہ کو دبا دیا۔ مگر جب انھوں سنّیوں کے دینی رہنما اور داروغۂ شریعت مفتی ظہور اللہ فرنگی محلی سے رائے مانگی تو انھوں نے بھی امام حسین کی شہادت کو مشکوک قرار دیا۔

ان کے فتویٰ کے بعد شیعوں اور سنّیوں دونوں میں بے چینی پھیل گئی کیوں کہ دنیا بھر میں پھیلے کڑوروں سنّی مسلمان بھلے ہی شیعوں کی طرح سینہ زنی یا ماتم و مجلس کے ذریعہ امام حسین کا غم نہ مناتے ہوں لیکن ان کی نظر میں وہ شہید راہ حق اور رسول اللہ کے مظلوم نواسے اور اک انقلابی اسلامی امام رہنما ضرور تھے۔

بے چینی و اضطراب کی اس گھڑی میں فرنگی محل کے ممتاز عالم دین مولانا عبد الواحد فرنگی محل کی ایک کتاب مسلمانوں میں اتحاد کا باعث بنی جس میں انھوں نے امام حسین کو ایک عظیم شہید قرار دے کر ان کا قتل ناحق کرنے والوں سے اظہار برائت کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ ان کے علاوہ ایک صوفی پیر غریب شاہ شاہجہاں پوری نے بھی امام حسین کی یاد میں تعزیہ اٹھائے جانے اور امام باڑے بنوانے کے لئے اپنے فرقہ کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔

لیکن انگریز برابر ریشہ دانیوں میں لگے ہوئے تھے۔ اور شیعہ سنّی فساد کی آگ میں مسلمانوں کی اس سلطنت کو جھونک دینا چاہتے تھے۔ نصر الدین حیدر کی وفات کے بعد ان کے چچا محمد علی شاہ کو مسند شاہی پر جلوہ افراز ہونے کا موقع ملا۔ ۱۸۳۷ء میں محمد علی شاہ نے انگریزوں کی کرتوت سے تنگ آکر ریزیڈنٹ کو یہ دھمکی بھی بھجوادی کہ اگر انگریزوں کی نامعقول حرکتیں اور

سازشیں اودھ کے خلاف جاری رہیں تو اودھ کی حکومت کمپنی بہادر سے تعلقات منقطع کر لے گی مگر ظاہر ہے محمد علی شاہ نہ تو اس دھمکی کو عملی جامہ پنہا سکتے تھے اور نہ برٹش سرکار ان کی دھمکی سے خائف ہونے والی تھی۔

محمد علی شاہ کے لئے یہی بہتر تھا کہ وہ خود کو مذہبی معاملات میں مصروف رکھیں اور بے چوں چرا ان انگریزوں کے تلوار کے سائے میں اودھ کی گل ہوتی ہوئی شمع کو روشن رکھیں۔ محمد علی شاہ نے اودھ میں اسلامی احکامات نافذ کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا تھا اس میں انھیں وقتی طور پر کامیابی تو ملی لیکن یہ کامیابی صرف بیس سال تک ہی چلنے والی ہے ایسا انھیں کہاں معلوم تھا ویسے بھی محمد علی شاہ کو سیاست سے نہ تو کوئی سروکار تھا نہ ان کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور عیاریوں کا مقابلہ کر سکتے اس لئے بعد میں انھوں نے ریزیڈنٹ سے تعلقات اچھے رکھنے میں ہی خیریت جانی اور خود کو مذہبی و فلاحی امور میں مصروف کر لیا مذہبی معاملات میں محمد علی شاہ نے نصیر الدین حیدر کی پیروی کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سلطان العلماء سے انھوں نے اچھے تعلقات پیدا کئے۔ محمد علی شاہ نے تحسین گنج میں ایک عالی شان جامع مسجد تعمیر کروائی مگر جب یہ مسجد بن کر تیار ہوئی تو تحسین گنج کے ایک سنّی باشندہ نعیم خاں نے سلطان العلماء سے شکایت کی کہ ان کی آراضی پر ناجائز قبضہ کر کے مسجد بنوائی گئی ہے سلطان العلماء نے جامع مسجد میں نماز پڑھانے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو فوراً نعیم خان کو بلوایا اور منہ مانگی قیمت دے کر زمین کا پٹہ حاصل کیا۔

محمد علی شاہ نے سلطان العلماء کے کہنے کے مطابق بہت سے امور خیر انجام دئے ان کے زمانے میں غرباء اور مفلوک الحال لوگوں کی اعانت کے لئے خصوصی اقدامات کئے گئے۔ انھوں نے لکھنؤ کے مشہور ترین بازار چوک میں شاہی شفاخانہ قائم کیا اور حیدر گنج کے پاس (وکٹوریہ گنج میں) ایک خیرات خانہ بھی قائم کیا۔ یہ خیرات خانہ اپنی نوعیت کا پہلا فلاحی ادارہ تھا جہاں معذور اور بے سہارا لوگ اپنی زندگی کے آخری ایام آکر گزارتے تھے یہ دونوں ادارے اب بھی موجود ہیں اور بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس جو تین لاکھ روپئے رکھوائے تھے اسی سے

ملنے والی رقم سے یہ دونوں ادارے زبوں حالی کے عالم میں چل رہے ہیں۔انھوں نے لکھنؤ کے بڑے امام باڑے سے تھوڑی دور پر حسین آباد محلّہ کی بنیاد ڈالی اور چھوٹے امام باڑہ کی شکل میں ایک خوبصورت عمارت بنوائی۔انھوں نے بمبئی میں ٹھرنے والے حاجیوں اور زائرین کے لئے مسافر خانے کا اہتمام بھی کیا۔

عراق میں کربلا سے نجف تک بہنے والی نہر آصفی کو وہابیوں کے حملہ میں تباہ و برباد کر دیا گیا تھا اس خبر سے سلطان العلماء کو بہت تکلیف تھی بادشاہ نے اس نہر کی تعمیر نو کے لئے ۱۸۳۹ء میں تین لاکھ روپئے اور ۱۸۴۱ء میں مزید ڈھائی لاکھ روپئے ریزیڈنٹ کی معرفت عراق بھجوائے۔ انہوں نے امام باڑوں کو وقف کرنے کا بھی بہت اہم کام انجام دیا اور باڑوں میں عزاداری کے مراسم کے لئے انگریزوں کے پاس کروڑوں روپئے جمع کروائے تاکہ اس سے امام باڑوں میں چراغاں و مجالس ہو سکیں۔وثیقہ داری بھی ان ہی کے پیسہ کی بدولت آج تک جاری و ثاری ہے۔

محمد علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے امجد علی شاہ کے زمانے میں عدل و انصاف کا محکمہ شیعہ علماء کے ہاتھ میں آگیا تھا ورنہ اس سے قبل تک فرنگی محل کے علماء ہی اس مسند پر فائض تھے۔فرنگی محل اور جوہری محلّہ کی دلدار منزل کے مابین بہت دوستانہ تعلقات تھے اس لئے سنّی فرقہ کے علماء نے اس پر کسی ناراضگی کا اظہار بھی نہیں کیا۔سلطان العلماء کے لئے بادشاہ کے دل میں اتنا احترام تھا کہ جو سلطان العلماء کہتے وہی بادشاہ کرتے عبدالحلیم شرر نے امجد علی شاہ کے بارے میں گزشتہ لکھنؤ میں لکھا ہے "بادشاہ چاہتے تھے کہ سلطان العلماء جس طرح جی چاہے اٹھائیں اور جس طرح جی چاہے بیٹھائیں۔"

سلطان العلماء کی خواہش پر امجد علی شاہ نے دوہرا نظام حکومت شروع کر دیا اس کے تحت علماء کو تعلیم عدل و انصاف اور امور خیر و فلاح کے محکمہ سونپ دئے گئے اور بادشاہ کے پاس دولت ،فوج اور بیرونی امور کے متعلق محکمہ رہ گئے۔بادشاہ کو اتنا بھی اختیار نہ تھا کہ وہ سلطان العلماء کے دئے ہوئے فیصلہ کو بدل سکے اور خود بادشاہ بھی قانون کے دائرہ سے باہر نہ رہا۔عوام کو بادشاہ پر مقدمہ دائر کرنے کا حق بھی مل گیا تھا۔اس زمانے میں شراب پینے اور جسم فروشی پر

پابندی عائد کی گئی۔ سلطان العلماء کی عدالت میں ایک تاجر نے بادشاہ کے خلاف ڈیڑھ لاکھ روپے کے ہر جانے کا مقدمہ دائر کیا اور فیصلہ بادشاہ کے خلاف ہوا اس لئے تاجر کو ڈیڑھ لاکھ کی رقم مل سکی۔ امجد علی شاہ کے جواں سال صاجزادہ واجد علی شاہ کے خلاف بھی سلطان العلماء کی عدالت سے کئی فیصلہ ہوئے۔

سلطان العلماء کی عدالت اسلامی اصولوں پر عمل پیرا تھی اور اس کو سرکاری ملائیت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا کیوں کہ سرکاری ملاؤں کے فیصلہ ہمیشہ بادشاہوں کے حق میں ہوتے ہیں اس لئے اس عدالت کو اس بات کا فخر حاصل تھا کہ بادشاہ کو بھی اسلامی اصولوں پر عمل درآمد کرنا ہوگا اور رعایا کو بھی۔ گو کہ عدل و انصاف کا محکمہ ایک شیعہ عالم دین کے پاس تھا مگر اس وقت کے سنّی علماء نے سینکڑوں سال پرانی کرسی چھن جانے کے بعد بھی صدائے احتجاج بلند نہ کی کیوں کہ سلطان العلماء نے سنی علماء کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ مولانا باقر شمس لکھنوی نے اپنی کتاب ہندوستان میں شیعت کی تاریخ میں لکھا ہے کہ "اگر چہ اس وقت حقیقت میں ایک شیعہ عالم دین کی حکومت تھی مگر سنّیوں کو مذہبی امور کی انجام دہی کی پوری آزادی حاصل تھی۔ جمعہ کے خطبہ سے لیکر عام دنوں کی نماز اور حصول علم کے معاملات میں سنّیوں کو پوری آزادی حاصل تھی۔ یہاں تک کہ شیعوں پر سخت سے سخت تنقید کرنے کی اجازت بھی انھیں حاصل تھی۔ خود سلطان العلماء کی تحریر کردہ کتابوں کے جواب میں سنّی فرقہ کے لوگوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں سلطان العماء کے لئے ہتک آمیز جملے اور توہین کرنے والی باتیں تک تحریر کی گئیں۔ سلطان العلماء اگر چاہتے تو ان سنّی علماء کے خلاف سخت اقدامات کر سکتے تھے مگر انھوں نے مذہب کی تبلیغ میں سختی نہیں برتی کیوں کہ وہ تحریر و تقریر کے جواب میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ جس طرح سے اعتراض کیا جاتا اس کا ویسا ہی جواب دیتے تھے"۔

سلطان العلماء کے اس رویہ کی وجہ سے شیعہ سنّی اختلافات نے کبھی بھی فساد کی شکل اختیار نہیں کی۔

اودھ کا آخری چراغ

امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے واجد علی شاہ نے مسند شاہی پر قدم رکھا۔ وہ عوام کے بادشاہ تھے اور یہاں کی رعایا ان سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ گو کہ انگریزوں کی نظر میں وہ ایک نااہل بادشاہ تھے مگر انھیں ہر طرح کے فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ جنگی فنون پر بھی بلا کی دسترس حاصل تھی۔ واجد علی شاہ جہاں ایک طرف کٹر شیعہ مسلمان تھے وہیں دوسری طرف وہ ایک سیکولر حکمراں بھی تھے۔ نماز و روزہ کے وہ بے انتہا پابند تھے اور ماتم و مجلس میں انہیں بے حد دلچسپی تھی۔

ہندو مسلم اور شیعہ سنّی اتحاد کے وہ زبردست حامی تھے۔ انھوں نے لکھنو کی گنگا جمنی تہذیب میں اپنے حسن سلوک سے چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ ہندوؤں کے تیوہاروں پر اگر کرشن کنھیا کا روپ دھارن کر کے رہس کتھاؤں میں حصہ لیتے اور کہیں وہ جان عالم پیا بن کر محفل سماع کی جان بن جاتے تو تعزیہ کے جلوس میں پابرہنہ ساتھ چلتے ہوئے نظر آتے۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ کی ثقافت اور تہذیب کو پنپنے کا بہترین موقع ملا ایک سیکولر بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مذہب کے اس قدر پابند تھے کہ انھوں نے زندگی میں کبھی بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اور اپنے حرم میں کسی ایسی عورت کو نہیں رکھا جس سے انھوں نے شیعہ عقیدہ کے مطابق متعہ یا نکاح نہ کیا ہو۔ واجد علی شاہ کے بارے میں عبدالحلیم شرر نے گزشتہ لکھنؤ میں لکھا ہے کہ "بادشاہ اپنے مذہب کے سخت پابند تھے مگر اس کے باوجود وہ سنّی شیعہ و ہندو سب کو برابر کا درجہ دیتے تھے اور کہتے تھے میری ایک آنکھ شیعہ ہے اور دوسری آنکھ سنّی"۔

واجد علی شاہ کو فن سپہ گری میں بہت دلچسپی تھی۔ ان کا روز کا معمول تھا کہ اپنے فوجیوں لو قواعدہ ضوابط کرواتے خود دھوپ میں گھوڑے پر سوار ہو کر مختلف جنگی مشقوں میں حصہ لینے والے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتے اور انعام و اکرام سے نوازتے انھوں نے اپنی فوج کی پلٹنوں کے

الگ الگ نام رکھے تھے اور ان کو چاق و چوبند بنائے رکھنے میں مستعد دکھائی پڑتے تھے۔ مگر انگریزوں نے پیغام بھجوایا کہ فوجی مشقوں میں بادشاہ کا شامل ہونا کمپنی بہادر کی منشا کے خلاف ہے تو بادشاہ نے خود کو دوسری مصروفیتوں میں الجھالیا۔ ان کو رقص و موسیقی کی مختلف اصناف کے بارے میں اس قدر معلومات تھیں کہ ہر تاریخ نگار اس کا معترف ہوا ہے۔ بادشاہ کو جنگلی جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے اس قدر شیر پال رکھے تھے کہ جب ملک اودھ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اور جانور نیلام ہوئے تو ۱۰۷ شیر بھی نیلام شدہ جانوروں میں شامل تھے۔

بادشاہ کو پہلے تو انگریزوں نے ملکی امور معاملات سلطنت اور حرب و ضرب کی مصروفیتوں میں حصہ لینے سے باز رکھا اور ایک مجبور ولاچار بادشاہ کو صرف نام کا بادشاہ بنا کر دوسری مصروفیتوں میں گرفتار کروادیا اور بعد میں ان کو بدنام کرنا شروع کیا کہ بادشاہ نالائق تھا نااہل تھا۔ لیکن بعد میں سب کو یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ وہ نااہل نہیں تھے بلکہ ایک لائق شاہ تھے۔ رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب واجد علی شاہ اور ان کا عہد میں تحریر کیا ہے ”جب تک واجد علی شاہ سے حکومت نہیں چھینی گئی تھی وہ ظالم تھے، ان کے اہلکار نکمے تھے، ان کا انتظام ناقص تھا لیکن جب تخت حکومت ان سے چھین لیا گیا تو رفتہ رفتہ لوگوں نے (اپنوں نے بھی اور غیروں نے بھی) محسوس کیا اور اعتراف کیا بادشاہ ظالم نہیں تھا ضبطی اودھ غیر قانونی اور اخلاقی اعتبار سے ایک شرمناک اقدام ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا بادشاہ کے جانے سے رعایا شاد اور آباد ہو گئی اب اعتراف کیا جانے لگا نہیں پہلے شاد تھی، اب ناشاد ہے، پہلے آباد تھی اب برباد ہے“۔

ویسے تو شاہ واجد علی پر بہت سے الزامات لگائے گئے یہاں تک کہ افضل التواریخ میں رام سہائے تمنا نے یہ الزام بھی عائد کر دیا کہ واجد علی شاہ کے عہد میں سنّی فرقہ کے لوگوں کو شیعہ ہونے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ جب کہ مشہور سنّی عالم عبدالحلیم شرر نے جو اپنے نانا منشی قمرالدین کے ساتھ بادشاہ کے ساتھ مٹیا برج میں بچپن سے عالم شباب تک رہ چکے تھے اس بات کی جگہ جگہ سختی سے تردید کی ہے کہ واجد علی شاہ سنّیوں یا شیعوں میں کوئی امتیاز برتتے تھے۔

ہنومان گڑھی کا قضیہ

عہد واجد علی شاہ میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا اس کو ختم کرنے کی سازشوں کے تحت ۱۸۵۵ء میں اودھ کو ایک نئے قضیہ اور بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ واجد علی شاہ اور ان کا عہد میں رئیس احمد جعفری نے ہنومان گڑھی کے قضیہ کے متعلق اس زمانے کی نایاب کتاب حدیقۃ الشہداء سے واقعات درج کئے ہیں۔ حدیقہ الشہداء کے مصنف مرزا جان کی تحریر سے ان کے انداز فکر اور ذہنی رجحان کا اندازہ لگانا بہت آسان ہو گیا ہے وہ چوں کہ شہید امیر علی امیٹھوی کے ساتھیوں میں سے تھے اس لئے ان کی تحریریں ان کے عقائد و طرز فکر کا رنگ اتنا غالب ہو گیا ہے کہ تعصب کی بو آنے لگی ہے۔ پھر بھی ان کی کتاب کی بہت اہمیت ہے کیونکہ اس موضوع پر اور زیادہ مواد کہیں دستیاب نہیں ہے اور یہ کتاب واقعہ کے صرف سال بھر کے اندر تحریر کی گئی ہے اس لئے اس کو نظر انداز کر کے اودھ کے زوال کی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔

ہنومان گڑھی کے قضیہ کے بارے میں مرزا جان لکھتے ہیں "اودھ میں ایک ٹیلہ تھا کافروں کی پرستش کا حیلہ تھا۔ راجہ رام چندر نے اس مقام پر ہنومان اپنے رفیق کو بٹھایا تھا جو بعد فتح لنکا اس کی بزرگی کا وسیلہ تھا۔ اس لئے ہنومان پرست اس کو ہنومان بیٹھک کہتے ہیں۔ بالفعل اس کا نام ہنومان گڑھی ہے۔ جب دستور وہاں بھی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی نے ایک مسجد قناتی بنوادی تھی۔ ہندوؤں کو اس مسجد کے مٹانے میں اصرار رہا۔ بعد چندے مسلمانوں کو غافل پا کے چاہا کہ پھر ٹھا کر دروازہ بنا کہ پوجا کا رنگ جمائیں۔ اور جس پر مورت ہنومان کی ہے یہاں وہی سنگ جمائیں۔ لیکن قاضی محمد عاقل نے جرأت کی اس مسجد کی مرمت کی اور انھیں کی اجازت سے پاتی شاہ فقیر مسلمان اس میں رہتا تھا نماز پڑھتا تھا اذان کہتا تھا۔ جب شجاع الدولہ بکسر کو گئے۔ متصل مسجد کے چھپر ڈال لیا اور ہنومان کی مورت کو اس میں قائم کیا مگر حاصل میں فقیر کا بھی حصہ رہا۔ جب فقیر کو تسخیر کر لیا رفتہ رفتہ مکان معقول تعمیر کر لیا تو آمد بھی زیادہ ہوئی ساری قوم پوجا پر آمادہ ہوئی۔ اس عرصہ میں فقیر مذکور نے انتقال کیا اس کے وارثوں نے مال تال لیا اور علیحدہ مسجد

سے عقب اس ٹیکری کے کہد نیا تالاب پر تکیہ جمالیا۔ لیکن اتیت مراعات کیے جاتے تھے حقوق فقیر دیئے جاتے تھے۔ بعد چندے بیراگھوں نے اتیتوں کو نکالا اپنا عمل کر کے مسجد کے منبر کو توڑ ڈالا۔ اس بات پر قاضی حبیب اللہ نے بلوہ کیا اور اقرار نامہ عدم تعرض لکھوا کے اور کسی فقیر مسلمان کو اذان کیواسطے مقرر کر دیا"۔ آگے لکھتے ہیں "جب بچھر ہٹہ کا ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا مسلمانوں کا سخت دشمن ہوا آس پاس اس ٹیلہ کے احاطہ کھنچوایا۔ لڑائی کے قابل بنوایا پھر تو کیا مثل مشہور ہے کہ ایک تو کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اس کے سبب بیراگی زور پکڑتے گئے مسجد کے آثار بگڑتے گئے۔ ہندوؤں کی نظامتیں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کو ان کے مقابلہ میں طاقت نہ رہی۔ حکام کو خیر و شر کی لیاقت نہ رہی۔ گرد اس مسجد کے حصار قائم کر کے ہنومان گڑھی اس کا نام رکھا۔ پرستش کا شغل صبح و شام رکھا۔ کافروں نے صحن مسجد میں بتخانہ بنالیا۔ ۱۲۷۱ھ میں عہد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا ہے شاہ غلام حسین صاحب کہ مرد باخدا حقیقت آشنا تھے۔ خدا کی راہ میں جان دینی فرض عین مانتے تھے اور مصاحب ان کے مولوی محمد صالح اسم مسمّٰی صلاح و تقویٰ میں درست راہ خدا میں بہت چالاک و چست عالم باعمل حق پرستوں بے بدل دونوں صاحبوں نے باہم مشورہ کر کے راہ خدا میں سر دینے کو قدم گاڑا ڈھال تلوار اٹھائی مشرکوں کی قتل پر نیت درست باندھی اور مسجد آباد اور بتخانے کو برباد کرنے پر مستعد ہوئے کمر ہمت چست باندھی بفرض جہاد حیدر آباد (لکھنؤ کا اک قدیمی محلّہ) میں کہ گومتی کے پار ہے محمدی جھنڈا قائم کیا"۔

شاہ عالم حسین اور مولوی محمد صالح کے اعلان جہاد میں مسلمان عوام کی عدم دلچسپی ایک لمبی داستان خود میرزا جان نے اسی کتاب میں بہت تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح کی جی توڑ کوششوں اور دو تین مہینے کی بھاگ دوڑ کے باوجود مسلمانوں کی بڑی جمعیت اس کام پر راضی نہ ہوئی بلکہ ان لوگوں کو سمجھانے اور رفع شر کے لئے بہت سے سمجھدار مسلمان مسلسل کوشش میں لگے رہے لکھنؤ کے کئی علماء بھی یہی کوشش کر رہے تھے کہ اس قبضہ کا پر امن حل نکل آئے لیکن شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح کسی بات پر راضی نہ ہوئے۔

حکومت کی طرف سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیانات لئے جا رہے تھے کہ مسجد وہاں تھی کہ

نہیں۔ لیکن پر جوش مسلمان کوئی بات سننے پر تیار ہی نہ تھے اور طاقت اور ہتھیاروں کے بل بوتے پر معاملہ کو حل کرنا چاہتے تھے۔ فیض آباد اور سلطان پور کے گورنر آغا علی خان مسلمانوں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور ہندوؤں کو سمجھانے کا ذمّہ راجہ مان سنگھ نے اپنے سر لے رکھا تھا۔ دو تین مہینے کے انتظار کے بعد اور معاملہ کا کوئی حل نہ نکلتا دیکھ شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح صاحب کی قیادت میں ۱۸۵۵ء میں جولائی کے مہینے میں سینکڑوں مسلمان ایودھیا میں وارد ہوئے تاکہ ہنومان گڑھی کا مندر گرا کر مسجد کی تعمیر ہو۔

یہ لوگ ۱۲ ذیعقدہ الحرام ۱۲۷۱ھ کو ایودھیا کی بابری مسجد مس ٹھہرے ان کے آنے کی خبر سن کر دس بارہ ہزار آدمیوں کی بھیڑ نے مسجد کو گھیر لیا اور ان لوگوں کو قتل کرنا چاہا مگر نائب کوتوال اور کپتان الکزنڈر کے سپاہیوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ کو رفع دفع کیا۔ لیکن مرزا جان کے مطابق مسجد میں ٹھہرے مسلمانوں میں سے دو افراد مسجد کے لئے ایک جوڑی دروازہ خریدنے کے لئے بازار میں گئے اور وہاں ان پر حملہ ہوا تو ان کی مدد کے لئے مسجد سے رستم علی خاں، بہادر علی خاں میاں فقیر بخش نائی، بہادر خاں اور ایک شخص مدد کے لئے پہنچے بھیڑ پر وار کر کے ان لوگوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کا یہاں تک کہ ہنومان گڑھی کے دروازہ تک پہنچ گئے مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے ان لوگوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ جب ان ساتوں کی شہادت کی خبر اہل مسجد کو ہوئی تو یہ لوگ بھی ہندوؤں سے لڑنے کے لئے نکلے مرزا جان لکھتے ہیں "ان تھوڑوں نے بہت کام کیا سیکڑوں کو تہ تیغ خون آشام کیا آخر جام شہادت پیا سید ھارستہ جنت کا لیا ساتوں کا شش جہت میں نام رہے گا۔ پنجتن اور چار یار حامی رہیں گے۔ گڑھی کے متصل یہ ہنگامہ ہوا مجاہدوں کو خبر ہوئی۔ ہتھیار باندھ کر ادھر بڑھے۔"

مسلمانوں کی طرف سے حملہ ہوا اور فریقین میں جم کر تلوار چلی ابھی یہ معرکہ جاری ہی تھا کہ شدید بارش آگئی اور مسلمان واپس بابری مسجد میں آکر قیام پذیر ہوئے۔ انگریزوں نے پیغام بھجوا دیا کہ اب اسلحہ اتار کر مسجد میں ہی اطمنان سے رہیں اب کوئی ان سے اس وقت تک نہ بولے گا جب تک کہ کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ سرکاری فوجیں مسجد سے تھوڑے فاصلے پر جا کر قیام پذیر

ہو گئیں مگر سرکاری فوج کے الگ ہوتے ہیں ایک عظیم بھیڑ نے مسجد میں قیام پذیر مسلمانوں پر حملہ کر کے وہاں موجود سب ہی مسلمانوں کا قتل عام کر دیا۔ بابری مسجد اور سیتا کی رسوئی کے مابین ایک کٹہرہ لگا تھا اس کو بھی ان حملہ آوروں نے توڑا اور مسجد کے ستونوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ بیراگیوں اور مہنتوں نے اس قتل عام کے بعد مسجد کے صحن میں آ کے ہون کیا سنکھ بجایا اور موہن بھوگ کھایا۔ اسی مسجد کے متصل ایک ٹیلہ تھا جس کا نام خواجہ مٹی تھا اور وہاں کئی مزار تھے ان کو بھی حملہ آوروں نے تباہ کر کے وہاں مورتی رکھ دی۔ اس حملہ میں مولوی محمد صالح بھی قتل کیے گئے اور شاہ غلام حسین فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد لکھنو میں شدید اشتعال پھیل گیا۔ اور مسلمان برافروختہ ہو کر اس واقعہ کا انتقام لینے اور مسجد کی تعمیر کی مانگ کرنے لگے بہت سے پرجوش مسلمانوں نے رائے بریلی کی امیٹھی قصبہ سے لکھنؤ میں وارد ہوئے جذباتی مذہبی رہنما سید امیر علی کی قیادت میں فیض آباد کی طرف کوچ کرنے کا عزم کر لیا۔ اسی بیچ ۳۰ اگست ۱۸۵۵ء کو مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب کی قیادت میں ایک وفد نے معاملہ کی جانچ کی تو ہنومان گڑھی میں کسی قناتی مسجد کے ہونے سے انکار کیا اور اس الزام کو بھی غلط پایا کہ وہاں کسی مسجد کو شہید کیا گیا تھا لیکن انھوں نے بیراگیوں کے ہاتھوں قتل کیے گئے مسلمانوں کے ورثاء کو خون بہادیے جانے کا فتوی بھی اسی رپورٹ میں دے دیا لیکن مولانا سید محمد صاحب ایک شیعہ عالم دین تھے اور ان کی بات پر مولانا امیر علی امیٹھوی اور دوسرے مسلمان اعتماد کرنے پر بھی راضی نہ تھے۔

واجد علی شاہ نے سید امیر علی کے سامنے ایک یہ تجویز رکھی کہ وہ ہنومان گڑھی کے پاس ایک شاندار مسجد بنوادیں گے اور ان کی طرف سے مکہ و مدینہ کے مقامات مقدسہ کے لئے پندرہ ہزار روپے کا نذرانہ بھیج دیں گے۔ لیکن جب ہنومان گڑھی کے پاس ایک مسجد کی تعمیر کے منصوبہ کا علم ہندوؤں کو ہوا تو انھوں نے سختی سے مخالفت کی اور خود سید امیر علی بھی اس پیشکش سے مطمئن نہ تھے۔ اور جہاد کے لئے کمربستہ تھے۔

۲۷ ۱۲۱ء محرم پڑا تو سنی فرقہ کے لوگوں کو کسی نے بھڑکا دیا اور انھوں نے ہنومان گڑھی

کے واقعہ پر احتجاج کرنے کے لئے تعزیہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ شہر کے کئی بڑے تعزیہ اس بار نہیں اٹھے۔ یہی نہیں لکھنؤ کے پڑوسی شہر بارہ بنکی کے قبضہ زیدپور میں جب کچھ شیعوں کو بھی تعزیہ دفن کرنے سے روکا گیا تو وہاں شیعہ سنّی فساد ہو گیا۔ واجد علی شاہ کی حکومت روز بروز نئی نئی مصیبتوں میں گرفتار ہوتی جا رہی تھی اور جنرل اوٹرم اور ڈلہوزی کا کہنا تھا کہ امیر علی کی سرگرمیوں پر سختی سے روک ٹوک نہیں کی جا رہی ہے اس لئے شاہ کو بیدخل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نواب علی نقی خان کا کہنا تھا کہ سختی کرنے سے معاملات اور بگڑ سکتے ہیں۔ واجد علی شاہ نے سید امیر علی کے اعلان جہاد کے لئے علماء سے فتاویٰ طلب کئے تو شیعہ و سنّی دونوں ہی علماء نے ان کی تحریک کو جہاد ماننے سے انکار کر دیا۔ شیعوں کی طرف سے سلطان العلماء سید محمد صاحب اور سید العلماء میرن صاحب اور سنّیوں کی طرف سے مولوی سعد اللہ اور مفتی محمد یوسف صاحب نے سید امیر علی کے جہاد کے نعرہ کو کالعدم کر دیا۔

مولوی امیر علی امیٹھوی لکھنؤ سے کوچ کر چکے تھے۔ اور ان کے ساتھ بیچارے سادہ لوح مسلمانوں کا ایک ہجوم آ گیا تھا اور اس میں بہت سے ایسے تھے جو گھر کا سامان تک بیچ کر آئے تھے کہ اب تو بس شہادت ہی قبول کرنا ہے اور ان کے لئے واپسی ناممکن تھی۔ امیر علی امیٹھوی سہالی دریا باد میں قیام پذیر تھے کہ واجد علی شاہ کا پیغام پہنچا کہ راجہ مان سنگھ کو بھیجا گیا ہے اور وہ ایودھیا کے مہنتوں کو لکھنؤ لے کر آئیں گے اور ان سے بات چیت کے بعد بہت جلد خانۂ خدا کی تعمیر ہو جائے گی۔ نواب نے سہ طرفہ بات چیت کا پروگرام رکھا امیر علی امیٹھوی کے تین نمائندہ ایودھیا کے دو مہنت اور چار آدمی سرکار سے اس بات چیت میں شامل ہوئے۔ مولوی امیر علی نے مولوی برہان الحق صاحب، مولوی عبدالرزاق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب کو اپنا نمائندہ بنایا جبکہ واجد علی شاہ نے احمد علی خاں، مولوی غلام جیلانی مولوی غلام امام شہید اور مولوی فضل الحق خیرآبادی کو دربار کا نمائندہ بنایا مگر یہ سہ طرفہ گفتگو ناکام ہو گئی۔ اس گفتگو کی ناکامی کے بعد ایک بار پھر سید امیر علی اپنے ساتھیوں کے ساتھ فیض آباد کے لئے کوچ کرنے پر کمربستہ ہوئے تو لکھنؤ کے مفتی محمد یوسف فرنگی محلی اور مفتی سعد اللہ خاں مرادآبادی نے سہالی پہنچ کر ان سے بہت کامیاب مباحثہ

کیااور مسلمانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالنے کی درخواست کی امیر علی امیٹھوی کے بہت سے ساتھی ان علماء کے کہنے کے بعد ارادۂ جہاد ترک کر کے اپنے گھروں کو چلنے پر راضی ہو گئے مگر وہ لوگ جو اپنا کاروبار گھر اور دوسرے معاملات ترک کر کے جہاد کی خاطر ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے تھے واپس جانے پر راضی نہ تھے۔ سید امیر علی کی تحریک کمزور پڑ گئی اور کئی بڑے سردار ان لشکر ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔

۲۵ صفر المظفر ۱۲۷۲ء کو سید امیر علی نے پھر کوچ کیا۔ ایک مرتبہ پھر ان کو سمجھانے بجھانے کے لئے شیخ حسین علی ان کے پاس گئے اور فوج کشی سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ شجاع گنج سے جب سید امیر علی ردولی کے طرف بڑھے تو راستے میں بارلو کی قیادت میں انگریزی فوج ان کی منتظر تھی۔ انگریزوں نے سید امیر علی اور انکے ساتھیوں کو گرفتار کر کے بہت بیدردی کے ساتھ قتل کر دیا اس طرح ایودھیا میں ہنومان گڑھی کے اندر مسجد ہونے کا مسلمانوں کا دعویٰ اور اس کی بازیابی کے لئے چل رہی پر جوش تحریک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ سید امیر علی کی تحریک سے انگریزوں کو مئے سہ آتشہ کا مزہ ملا۔ اول تو یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین زبردست نفرت پیدا ہو گئی دوسرے یہ کہ اس تحریک کو کسی حد تک شیعہ سنّی قضیہ بھی بنا دیا گیا (گو کہ اس تحریک سے کئی شیعہ بھی متفق تھے) تیسرے یہ کہ واجد علی شاہ کو ایک ہی سال کے عرصہ میں معزول کر کے قید کر لیا گیا۔ بادشاہ کو نااہل ثابت کر کے (دنیا کی سب سے اہل قوم نے) اودھ کو ملکہ وکٹوریہ کے تاج کا نگینہ بنا دیا۔

واجد علی شاہ نے انگریزوں کی عیاری کے سامنے صرف اتنی مزاحمت ہی کی کہ خود انھوں نے اس پروانے پر دستخط نہیں کئے جس کے تحت ان کو اودھ کی حکومت انگریزوں کے حوالے کرنا تھی۔ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سال قبل کی وہ سازش جس کے تحت وہ جہانگیری کے خواب دیکھ رہے تھے اب رنگ لا چکی تھی مگر واجد علی شاہ کی طرف سے فوجی مزاحمت نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انگریزوں کے دامن میں اودھ بے چوں چراں چلا گیا۔

پہلی جنگ آزادی کی شروعات

اودھ کے غیرت مند ہندو اور مسلمان اس دغابازی اور مکاری کا بدلہ لینے کے لئے کھڑے ہو گئے کیوں کہ پروپگینڈہ جو کچھ بھی کیا جارہا تھا اس کے برعکس واجد علی شاہ سے ان کی رعایا بہت خوش تھی رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں "واجد علی شاہ کے کردار اور سیرت کو آج کتنے ہی بھیانک اور گھناؤنے روپ میں پیش کیا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی رعایا اور فوج دونوں میں حد درجے ہر دلعزیز تھے، جو ہر دلعزیزی واجد علی شاہ کو اپنے ملک میں حاصل تھی وہ بہادر شاہ ظفر کو کبھی نہ حاصل ہو سکی اگر چہ بہادر شاہ اور ان کی رعایا کا مذہب ایک تھا لیکن واجد علی شاہ اور ان کی رعایا کے مذہب میں اختلاف تھا۔ وہ شیعہ تھے یہ سنّی تھے اور دونوں اپنے مذہب پر سختی سے قائم تھے پھر بھی دونوں کے درمیان طبیعت اور عقیدت کا ایسا رشتہ استوار تھا کہ گو کہ ضبطی اودھ کے کاغذات مرتب ہو چکے تھے، اوجد علی شاہ کی معزدلی کا فیصلہ ہو رہا تھا لیکن بغاوت کے اندیشے سے انگریزوں کے دل دھڑک رہے تھے"۔

۱۲ فروری ۱۸۵۶ء کو کمپنی بہادر نے بادشاہ کی معزدلی کا اشتہار نکلوادیا اور ضبطی اودھ کے احکامات صادر ہو گئے۔ اور انگریزوں نے ۷ افروری ۱۸۵۶ء کو برٹش راج میں اودھ کا الحاق کر لیا۔ معزدلی کے بعد واجد علی شاہ نے تقریباً ایک مہینہ لکھنؤ میں ہی گزارا اور طرح طرح کی افواہوں اور قیاس آرائیوں کے بیچ ۱۳ مارچ کو لکھنؤ سے کوچ کیا اور کانپور پہنچے۔ واجد علی شاہ کی روانگی کے وقت لکھنؤ میں رعایا پر جو غم واندوہ طاری تھا اس کا ذکر جابجا کتابوں میں موجود ہے اودھ کے سب سے ہر دلعزیز بادشاہ کو جب لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو خود ان پر بھی اس کا بے انتہا اثر تھا۔ بہر حال واجد علی شاہ کانپور سے بنارس اور پھر وہاں سے کلکتہ پہنچے اور لکھنؤ کی تہذیب مٹیا برج کے علاقہ میں پھیلنے لگی۔ لکھنؤ میں آزادی کا بگل بجا تو شاہ غازی الدین حیدر کی قائم کی ہوئی شاہی کو ختم کر کے بیگم حضرت محل نے برجیس قدر کی حکومت کے مغل سلطنت کے ماتحت ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح غازی الدین حیدر کے زمانے میں دہلی اور لکھنؤ کے مابین جو رشتہ ٹوٹ گیا تھا

اس کو پھر سے استوار کرنے کی کوشش کی مگر ایک بجھتے ہوئے چراغ کو ایک بجھتا چراغ کیا سہارا دیتا؟

اسی ہنگامے میں لکھنو کے شیعوں کے درمیان ایک نیا جوش پیدا ہو گیا اور اس جوش کے نتیجہ میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ رسالہ علم الحیدری میں بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار دہلی کے شیعہ ہو جانے کا قصہ ان الفاظ میں درج ہے "سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب طاب ثراہ نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو شیعہ کیا چنانچہ بہادر شاہ ظفر نے ایک علالت کے سلسلے میں امام باڑہ کی تعمیر کی اور درگاہ حضرت عباس میں ایک علم کے چڑھاوے سے اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کیا۔ بعد صحت بہادر شاہ ظفر نے سلطان العلماء مولانا سید صاحب قبلہ کو یہ خط لکھا" افضل الفضلاء ،الفقیہ الفقہا سید السادات، مقتدائی مومنین و مومنات مجتہد العصر و الزمان سلطان العلماء دامت برکاتہ محمد اللہ المنہ محبت ولائی اہل بیت علیہم اسلام اختیار کردہ ام و از اعدائے علیؑ بن ابی طالب تبرا نمودم و تعمیر امام باڑہ شروع گردیدہ است، بعد اتمامش مجالس تعزیت جناب سید الشہداء امام حسین علیہ السلام مقرر خواہد شد۔ السعی منی و لا تمام من اللہ مفصل مدارج دینیہ کہ بروں راسخ ام زبانی برخوردار کامگار والا تبار سعادت اطوار مرزا محمد حیدر شکوہ بہادر کہ دریں خصوصی راز دار است دریافت خواہد شد۔ اس خط کے بعد لکھنؤ میں شاہی علم آیا جس کو سلطان العلماء نے بڑے شاہانہ اہتمام و جلوس کے ساتھ درگاہ حضرت عباس میں جا کر نصب کیا۔ دہلی میں جو یہ خبر پہنچی تو آگ لگ گئی اور وہی ہوا جو بہادر شاہ اول کے عہد میں ہوا تھا بادشاہ کو تبدیلی مذہب پر مجبور کیا گیا اور بادشاہ کے لئے سوائے تردید واقعہ کے چارہ نہ تھا۔"

ڈوبتی ہوئی سرکار کے شیعہ ہونے یا سنّی ہونے کا کوئی فائدہ اسلام کو تو ہونے والا نہیں تھا البتہ ان جھگڑوں کا فائدہ گورے حکمرانوں کو ضرور پہنچ رہا تھا بہادر شاہ ظفر (جنکی حکومت صرف لال قلعہ کی فیصلوں تک محدود تھی) کے شیعہ ہو جانے کی خوشی بالکل عارضی ثابت ہوئی اور ان کو خود ہی تردید کرنا پڑی کہ میں نے صرف نذر مانی تھی صحتیابی کے بعد اسی کو پورا کیا ہے اور پھر انگریز بہادر نے تابوت کی آخری کیلیں بھی ٹھونک دیں بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر رنگون

بھیج دیا۔ ان سب جھگڑوں کے باوجود اودھ میں شیعہ اور سنّی دونوں ہی ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی کی دہلی جنگ میں جوش و خروش سے حصہ لے کر خود کو قربانی کے لئے پیش کر رہے تھے۔ اس بیچ فیض آباد میں مدراس کے مولانا احمد اللہ شاہ شریف فرماتھے وہ مولانا سید امیر علی امیٹھوی کی شہادت سے کافی متاثر تھے اور کچھ تحریک چلانا چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے گرفتار کر کے انھیں جیل میں ڈال دیا۔ جب بغاوت ہوئی تو فیض آباد کا جیل خانہ بھی ٹوٹ گیااور مولانا احمد اللہ شاہ بھی فرار ہو کر لکھنؤ آئے۔ یہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ حضرت محل نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور عوام نے بھی ان کو بہت مرتبہ دیا مولانا احمد اللہ شاہ نے تارہ والی کوٹھی میں سکونت اختیار کی اوراسی میں اپنادربار قائم کیا۔ جنگ آزادی کے متوالے یہیں جمع ہو کر مشورہ کرتے تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کے تعارف میں رئیس احمد جعفری نے جو کلمات تحریر کئے ان کا لکھنا ضروری ہے

”مولانا احمد اللہ شاہ مدراس کے رہنے والے تھے۔ اونچے گھرانے میں پیدا ہوئے سن تمیز کو پہنچے تو علم سینہ اور علم سفینہ کے ماہر ہو چکے تھے۔ معقول و منقول پر گہری نظر رکھتے تھے چاہتے تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے لیکن قدرت نے انھیں چشم حیراں اور دل بے تاب کی دولت سے نوازا تھا۔ وہ غیور و حساس طبیعت کے مالک تھے۔ مسلمانوں کے ادبار و زوال نے ان کی روح میں ہلچل برپا کر دی تھی، ان کا سینہ محشرستان جذبات بنا ہوا تھا۔ مسلمان تباہ ہو چکے تھے، مسلمان امراء اور جاگیر دار خواب خرگوش میں مست تھے نہ فکر امروز نہ فکر فردا مسلمان حکومتیں ایک۔ ایک کر کے مٹ رہی تھیں۔ میسور اور سری رنگاپٹنم کی اسلامی حکومت ختم ہو چکی تھی حیدر آباد اپنی غداری کی بدولت سلامت تھا لیکن شکنجہ میں جکڑا ہوا۔ دلی میں مغلیہ خاندان کا چراغ بہادر شاہ ظفر کی صورت میں ٹمٹما رہا تھا۔ باد تند کے جھونکے اسے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے اودھ میں واجد علی شاہ کا آفتاب حکومت گہن میں آچکا تھا۔ انگریزوں کا تسلط مستحکم سے مستحکم تر ہو تا چلا جا رہا تھا۔ انگریزوں کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی دوسرے میں انجیل۔ تلوار اس لئے تھی کہ جس آدمی میں خودی، خودداری، سرکشی، بغاوت، آزادی اور حریت کے جراثیم پائے جائیں اس کی گردن تراش دی جائے۔ انجیل اس لئے تھی کہ مرعوب و دہشت زدہ آشفتہ روزگار پریشان حال مفلس

اور قلاش لوگوں کو مسیح کے گلہ میں شریک کر لیا جائے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کے جذبہ جہاد، جوش پیکار اور شوق شہادت کا یہ پس منظر تھا۔"

غدر کا ہنگام

واجد علی شاہ کی معزدلی کے بعد عوام کے دلوں میں جو رنج و غم تھا وہ اب طوفان کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ انگریزی فوج کے وہ باغی سپاہی جو کارتوسوں میں سور اور گائے کی چربی ملائے جانے سے ناراض ہو کر باغی ہو گئے تھے اس طوفان کو اور تیزی دینے کے لئے اودھ میں پہنچ گئے۔ ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کو یہ انقلابی لکھنؤ کے قریب پہنچے اور انگریزوں کو شکست دے کر لکھنؤ میں بیلی گارد اور مچھی بھون کا محاصرہ کر لیا۔ ۳ جولائی تک یہ لوگ شہر پر قابض رہے تب بیگم حضرت محل سے یہ درخواست کی گئی کہ شاہزادہ برجیس قدر کو تخت واجدی پر بیٹھا دیا جائے تاکہ بغیر کسی رہنما کے چل رہی جنگ آزادی کو ایک رہنما مل سکے۔ الغرض ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو احمد حسین خاں کی تحریک اور نواب مموخاں کی تائید سے برجیس قدر مسند شاہی پر رونق افروز ہوئے۔ شہاب الدین اور سید برکاۃ احمد سالار نے برجیس قدر کے سر پر تاج رکھا۔ اور جنگ آزادی زور شور سے شروع ہو گئی رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں ہندو مسلمان شیعہ سنّی سب مسادی طور پر شریک تھے اس لئے کہ یہ عوامی جنگ تھی بعض لوگوں نے شیعہ سنّی اور ہندو مسلم سوال پیدا کر کے افتراق برپا کرنے کی کوشش کی تھی اور بعد میں بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے کہ جنگ آزادی ناکام ہو گئی لیکن جہاں تک حضرت محل، برجیس قدر مموخاں وغیرہ کا تعلق تھا یہ لوگ شیعہ ہونے کے باوجود واجد علی شاہ کے مسلک کے مطابق ہمیشہ ہندو و مسلم اور شیعہ سنّی سوال سے بالاتر رہے چنانچہ نئی حکومت میں جو عہدے تقسیم ہوئے ان کی بنیاد صرف اہلیت تھی نہ کہ مذہب فرقہ اور جماعت اسی لئے بیگم حضرت محل اور مولانا احمد اللہ شاہ کی فوجیں انگریزوں کے خلاف جب تک مل کر لڑیں غازیان اسلام کو روز بروز فتوحات ملتی گئیں۔" مگر انگریز بہادر کو آخر کار کامیابی مل ہی گئی اور آزادی کے متوالوں کے درمیان شیعہ سنّی مفسدہ پھیل گیا۔

رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں "بد قسمتی سے مولانا احمد اللہ اور حضرت محل کے معتمد خاص ممو خاں میں اختلاف پیدا ہو گیا یہ اختلاف اقتدار کی کشمکش پر مبنی تھا۔ ممو خاں کی خواہش تھی کہ سب کچھ ان ہی کے ہاتھ میں رہے مولانا چاہتے تھے ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ ہو۔ مصارف جنگ کے لئے ممو خاں نے شہر کے دولتمندوں، مہاجنوں اور سرمایہ داروں پر ٹیکس عائد کیا۔ مولانا نے اسے ناپسند کیا۔ دونوں میں باقاعدہ کشمکش کا آغاز ہو گیا اور یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ اگر یہ ذاتی اختلاف تک محدود رہتی تو شائد ناگوار صورت پیدا نہ ہوتی لیکن بد قسمتی سے بہت جلد یہ شیعہ سنّی کشمکش میں تبدیل ہو گئی۔"

ایک بار تو بیگم حضرت محل کی فوجوں اور احمد اللہ شاہ کے ساتھیوں کے درمیان جنگ بھی ہو گئی اور تقریباً سو لوگ اس میں ہلاک ہو گئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کو بیگم کی فوجوں نے گرفتار بھی کر لیا مگر مولانا خود کو رہا کروانے میں کامیاب ہو گئے بہر حال یہ دونوں طاقتیں انگریزوں کے خلاف اب الگ الگ صف آرا تھیں اور نتیجہ تو جو ہونا تھا سو ہوا لیکن شائد یہ جھگڑا نہ ہوتا تو جنگ آزادی کا رخ دوسرا ہی ہوتا۔ انجام کار ۱۰ مارچ ۱۹۵۸ء کو لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا انگریزوں کو راجہ نیپال کی مدد سے اودھ کی اس آگ کو سرد کرنے میں کامیابی ملی اور برجیس قدر و حضرت محل کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے حضرت محل اور برجس قدر کی شکست اور اودھ سے فرار کا واقعہ ان الفاظ میں لکھا ہے "ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو جائیں اور جب موقع ملے نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں۔ فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں شکست ہو تو پھر بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لیں ریاست نیپال نے مرزا برجیس قدر اور ان کی ماں کو تو پناہ دے دی مگر ان کے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو حکم دے دیا کے فوراً واپس جائیں، بہت سے بھاگے، بہت سے مارے گئے، بہت سے بھیس بدل کر کسی طرف نکل گئے مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال میں جائے سکونت پذیر ہو گئے دربار نیپال سے ان کے لئے کچھ معمولی وظیفہ ہو گیا اور ان کے ساتھ جس قدر جواہرات تھے سب حکومت نیپال کی نذر ہوئے"۔ اس واقعہ سے علم ہوتا ہے کہ حضرت محل اور

برجیس قدر کا فرار بزدلی یا جان بچانے کا فرار نہ تھا بلکہ وہ دوبارہ حملہ کرنے کا عزم رکھتے تھے مگر نیپال کے راجہ جنگ بہادر نے جو پہلے ہی سے انگریزوں کا معاون ومددگار تھا ان کے اس عزم کو ناکام کر دیا اور ان کے ساتھیوں کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں پر خوب مظالم ڈھائے عبادت گاہوں پر قبضہ کیا امام باڑوں اور مسجدوں کو سرکاری دفاتر، چھاؤنی اور کورٹ کچہری بنادیا۔ یہاں تک کہ بڑے امام باڑے اور ٹیلہ والی مسجد پر بھی قبضہ کر لیا۔ سینکڑوں لوگوں کو پھانسی کی سزا ہوئی اور نہ جانے کتنے کالے پانی کی سزا سے نوازے گئے۔ لکھنؤ والوں پر اس قدر مظالم ہوئے کے کسی میں اتنی طاقت نہ رہی کہ انگریزوں کے جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھاتا۔ حسین آباد کے امام باڑہ اور بڑے امام باڑہ کی پشت پر آباد سینکڑوں عالی شان مکان اور حویلیوں کو گرا کر کمپنی باغ بنوادیا گیا۔ (حال ہی میں وہاں چل رہی کھدائی میں ایسے کئی مکانات کے آثار بھی ملے تھے) نہ جانے کتنے امام باڑہ اور مسجدیں تو غدر کے دوران گولا باری میں تباہ ہو گئیں تھیں اور کتنے ہی انگریزوں کے گھروں اور دفتروں میں بدل گئے۔ چتر منزل، چو لکھی اور خورشید منزل کا تو ذکر ہی کیا۔ سبطین آباد کا امام باڑہ جو حضرت گنج میں تھا عیسائیوں کی جائے رہائش بن گیا نہ ہی کی کربلا میں اسکاٹش مینس لاج کا قیام ہوا (اب یہ کربلا پارسیوں کے قبضہ میں ہے) قیصر باغ میں واقع خوبصورت امام باڑہ قصر البکا انجمن تعلق داران اودھ کو انگریزوں کی مدح خوانی کے عیوض تحفہ میں مل گیا۔ (اب اس کو قیصر باغ بارہ دری کہا جاتا ہے اور یہاں شادی بیاہ کی محفلیں ہوتی ہیں) مولانا دلدار علی صاحب کے بنوائے ہوئے امام باڑہ غفر انماب کی کئی بیگھا آراضی بھی انگریزوں نے ہتھیالی۔

ایک طرف تو شاہی چھن جانے کا رنج وملال تھا تو دوسری طرف مذہبی عمارتوں پر انگریزوں کا جارحانہ قبضہ اور بے ادبی۔ نہ تو شیعوں کا کوئی سیاسی قائد تھا نہ سنّیوں کا چھوٹے موٹے راجا مہاراجہ اور زمیندار اب انگریزوں کی خوشامد اور چاپلوسی کر کے زندہ رہنے پر مجبور تھے۔ غم و اندوہ کے اسی عالم میں مذہبی جلوسوں پر بھی سرکار کی طرف سے پابندیاں عائد ہونا شروع ہوئیں بالخصوص عزاداری کے جلوسوں سے انگریزوں کو کافی اندیشہ تھا، کیوں کہ امام حسین کی شہادت

کے واقعہ کو یاد کر کے اکثر مسلمان حکومت ظالم کے خلاف خود کو جہاد پر آمادہ پاتے ہیں۔

سوا دو مہینے کی عزاداری

محرم میں بارہ دنوں تک چلنے والا سوگ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ہی بڑھ کر چالیس دن تک ہو گیا تھا۔ اور شہر کے اکثر گھروں میں چالیس دن تک مجالس و ماتم کا اہتمام ہونے لگا تھا۔ شہر کے ایک معروف رئیس نواب احمد علی خاں کے گھر سے بہت تزک و احتشام سے چہلم کے روز تعزیہ اٹھا کرتا تھا۔ لیکن اتفاق سے کانپور کے کسی احمد علی خاں نام کے ایک شخص نے ایک انگریزی جرنیل کی بیوی کو گولی مار دی اور روپوش ہو گیا۔ لکھنؤ کے نواب احمد علی خاں بہت معروف شخصیت تھے اور انگریزوں سے متنفر بھی رہتے تھے۔ لٰہذا مقتولہ کا شوہر ان احمد علی خاں کو اصلی قاتل سمجھ کر محل سرا میں گھس آیا اور ان پر فائر کرنا چاہا مگر نشانہ خطا ہو گیا اور نواب صاحب کی جان بچ گئی۔ اس واقعہ کے بعد بجائے اس کے کہ حملہ آور گرفتار ہوتا نواب احمد علی خاں گرفتار ہوئے اور ان پر قتل کا مقدمہ چلا اور جرنیل کی بیوی کے قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ جس دن نواب صاحب کو پھانسی ہونے والی تھی اسی دن کان پور والے احمد علی خاں نے خود کو حاضر عدالت کر دیا اس طرح نواب احمد علی خاں لکھنوی پھانسی کے پھندہ سے بچ گئے۔ یہ واقعہ صفر المظفر کے مہینے کا ہے چہلم کے کچھ دن باقی تھے اس لئے نواب صاحب تعزیہ اٹھانے کا خاطر خواہ انتظام نہ کر سکے تو پھر ان کے ایک دوست نے رائے دی کہ وہ امام حسن عسکری کے یوم شہادت کے موقع پر ۸ ربیع الاول کو تعزیہ اٹھائیں۔ نواب صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا اور آٹھ ربیع الاول کو تزک و احتشام کے بغیر صبح سویرے تعزیہ کا جلوس اٹھایا۔ اس تعزیہ کے خاموشی سے اٹھائے جانے کی بابت دو باتیں مشہور ہیں ایک تو یہ کہ خود نواب صاحب علم و ماہی مراتب و بینڈ باجہ کا انتظام کرنے کی استطاعت کھو چکے تھے دوسرے یہ کہ انگریز حاکموں نے انھیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی چونکہ اس وقت تک تعزیہ صرف چہلم کے دن تک ہی اٹھتے تھے لٰہذا حاکم شہر نے اس نئے جلوس کی اجازت اس شرط پر ہی دی تھی کہ تعزیہ کے ساتھ نہ تو فوجی باجے ہوں

گے نہ ماہی و مراتب یہاں تک کہ یہ جلوس شہر کی ٹریفک پر بھی اثر انداز نہ ہو اسی خیال سے تاروں کی چھاؤں میں جلوس نکالنے کی اجازت دی گئی۔

جب یہ جلوس نکلا تو اس کے شرکاء تعزیہ کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چل رہے تھے اور بیچ میں کہیں کہیں ایک نقیب مرثیہ کے چند بند بلند آواز میں پڑھ کر مجمع پر رقّت طاری کروا رہا تھا۔ یہی جلوس چپ تعزیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جلوس کے ساتھ ایک زبردست تبدیلی یہ آئی کہ چالیس دن تک چلنے والے ایام عزا کی مدت خود بخود دو مہینے آٹھ دن ہو گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ شیعہ سلطنت کے خاتمہ اور انگریزوں کے مسلط ہو جانے کے صدمہ سے دوچار لکھنؤ کے عوام پہلے ہی سے رنجیدہ و غمزدہ تھے لہٰذا انھوں نے اپنے آپ ہی ایام عزا کی مدّت بڑھالی۔ اور اپنے غم کو غم حسین کے سائے میں جگہ دے کر راحت کی سانس لی۔ اس سلسلے میں نہ تو علماء نے کوئی فتویٰ جاری کیا اور نہ ہی کسی تنظیم نے ایام عزا کو بڑھائے جانے کی سفارش کی۔ رفتہ رفتہ یوپی کے دوسرے شہروں میں بھی چپ تعزیہ کے نام سے جلوس اٹھنے لگے اور سوا دو مہینے تک عزاداری ہونے لگی۔ اور اب تو برصغیر میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں جہاں جہاں ایشیائی شیعہ رہتے ہیں دو مہینے آٹھ دن تک ماتم و مجالس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور خوشی کی تقریبات موقوف رہتی ہیں۔

عالم دین کا نعرۂ انقلاب

انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کرنے کے بعد شیعوں کی تمام اہم زمینوں اور بلڈنگوں پر قبضہ کر لیا تھا لہٰذا بڑے امام باڑے کی تاریخی عمارت پر انھوں غاصبانہ قبضہ کر کے اس کو چھاؤنی میں تبدیل کر دیا اور ٹیلے والے مسجد کے نام سے مشہور شاہ پیر محمد کی مسجد میں عدالت قائم کر دی تھی۔

ان دنوں شیعہ فرقہ کی عید اور بقر عید کی نماز تحسین گنج کی جامع مسجد میں ادا کی جاتی تھی خاندان اجتہاد کے انقلابی عالم دین مولانا سید ابراہیم صاحب نے ٹیلے والی مسجد اور بڑے امام باڑے

کو خالی کیئے جانے کی مانگ رکھ دی انگریزوں نے کہا کہ شیعہ حضرات تحسین گنج میں نماز پڑھ سکتے ہیں اس پر مولانا سید ابراہیم صاحب نے فتویٰ دیا کہ شیعوں کے عقائد کے مطابق عیدین کی نماز آبادی سے ذراہٹ کر ہونا چاہئے اور چونکہ تحسین گنج میں آبادی زیادہ ہو گئی ہے اس لئے آصفی امام باڑے کی مسجد میں ہی شیعوں کے لئے نماز پڑھنا مناسب ہے ٹیلے والی مسجد پر بھی چونکہ سنّیوں کی جمعۃ الوداع کے دن سب سے بڑی نماز ہوتی تھی اس لئے ابراہیم صاحب کے نعرے پر وہ بھی متحد ہو کر شیعوں کے ساتھ آگئے۔ انگریزوں نے معاملہ کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے دونوں عبادت گاہوں کو خالی کر کے بڑھتی ہوئی بغاوت پر قابو پالیا۔ لیکن ان کے دل میں اس شیعہ سنّی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی سازشیں تیار ہوتی رہیں۔

اذان پر فساد

انگریزوں کی حکومت میں ایک اور فتنہ بھی کھڑا ہوا ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ کے ڈالی گنج کے علاقہ میں ایک شیعہ مسجد سے اذان میں حضرت علی کو خلیفہ ُبلا فصل کہے جانے پر سنیوں نے اعتراض کیا جس کے بعد فساد بھڑک اٹھا۔ سنّیوں کی بھیڑ نے مسجد پر حملہ کر دیا لیکن محلّہ کے ہندوؤں کی مداخلت کے بعد فساد تھم گیا۔ لیکن اس کے بعد انگریزوں نے اذان میں حضرت علی کے لئے خلیفہ ُبلا فصل کہے جانے پر پابندی لگا دی۔ بعد میں معاملہ جنرل ایم کاب کی عدالت میں پہنچا۔ ایم کاب نے فیصلہ سنّیوں کے حق میں دیا اور شیعوں کے لئے ممانعت کر دی کہ اذان میں اپنے عقیدہ کا اظہار نہ کریں۔ تب مولانا دلدار علی غفرانماب کے انقلابی پوتے مولانا سید ابراہیم صاحب میدان عمل میں سرگرم ہو گئے انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کے پاس شیعوں کا مقدمہ بھیجا اور اس میں کہا کہ شیعوں کے مذہب کی بنیاد ہی اس ٹکڑے پر قائم ہے اگر حضرت علی کو پیغمبر حضرت محمد کا براہ راست وارث شیعہ نہ سمجھتے تو پھر یہ فرقہ ہی وجود میں کیسے آتا ملکہ وکٹوریہ نے شیعوں کا حق تسلیم کیا اور شعیوں کو حضرت علی کو خلیفہ بلا فصل کہے جانے کی اجازت مل گئی اس کے بعد شیعوں اور انگریزوں میں تعلقات استوار ہو گئے

بیسویں صدی کے جھگڑے

نئ صدی انسانوں کے لئے قتل وغارت گری کا پیغام لے کر آئی تھی گوری چمڑی والے انسانوں کی مہربانی سے دنیا پہلی جنگ عظیم کے دہانے پر کھڑی تھی۔ مسلمان ممالک کو مہرہ کے بطور استعمال کیا جارہا تھا مسلم ممالک کو جنگ عظیم میں جھونکنے کی کوشش ایک طرف تھی تو دوسری طرف مسلمانوں کو لسان، قبیلہ مسلک اور قومیت جیسے مسلکوں پر بانٹنے کی سازشیں بھی جاری تھیں۔

ہندوستان میں بھی مسلمان دو گروہوں میں بٹے تھے ایک گروہ تو انگریزوں کا ہمنوا تھا جو مسلمانوں کو آئی سی ایس اور آئی پی ایس بنا کر ان کے مستقبل کو انگریزوں کو حوالے کرنا چاہتا تھا اور دوسرا گروہ جذباتی مسلمانوں پر مشتمل تھا جو ہندوستان کی آزادی کا متوالہ تھا مگر یہ گروہ ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً شکست کھا کر خاموش تھا۔

انگریزوں کا راج روز بروز پھیلتا جارہا تھا اور سورج ان کے راج میں ڈوبتا ہی نہیں تھا مگر مسلمانوں کے لئے ہر دن ایک نئے اندھیرے کا پیغام لا رہا تھا ان ہی تاریکیوں کے سائے میں لکھنؤ سے ۱۳کلو میٹر دور واقع قصبہ کاکوری سے ایک سنّی عالم دین مولانا عبدالشکور لکھنؤ تشریف لائے اور پاٹا نالہ کے علاقہ میں آکر بسے جہاں انھوں نے دارالمبلغین کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد بھی ڈالی۔ یہ مدرسہ نفرت کی بنیادوں پر قائم ہوا اور اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ شیعوں کے خلاف نفرت پھیلائی جائے۔ یہاں پڑھائی جانے والی کتابوں کو دیکھ کر اس بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ یہاں مسلمانوں کے مابین اختلافات کو ہوا دینے کے لئے کتنی رقم خرچ کی جارہی ہے افسوس تو اس بات کا ہے کہ جب آر ایس ایس کے اسکولوں میں مسلمانوں کے خلاف لٹریچر پڑھایا جاتا ہے تو مسلمان خوب ہنگامہ مچاتے ہیں لیکن جب خود ان ہی کے کچھ مدرسوں میں نفرت آمیز درس کی بات سامنے آتی کرتی ہے تو سب خاموش ہو جاتے ہیں۔

مولانا عبدالشکور صاحب نے اپنی شیعہ مخالف مہم کا آغاز تعزیہ داری کے جلوسوں میں

چاریاری نظموں کے پڑھے جانے سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعزیہ کے آگے شہیدان کربلا کے ذکر سے پہلے 'چاریار' کا ذکر ہونا چاہئے دراصل اس وقت تعزیہ داری سنّیوں میں اتنی مقبول ہو چکی تھی کہ اس کو بدعت کہنا ممکن نہیں تھا اس لئے مولانا عبدالشکور نے ایک اور بدعت کی ابتداء کی یعنی چاریاری نظموں کا گانا بعد میں ان چاریاری نظموں کو مدح صحابہ کا نام دیا گیا جو اصل میں مدح اہلبیتؑ اور کربلا کے شہیدوں کی یاد میں پڑھے جانے والے نوحوں کی کاٹ تھی۔ مدح صحابہ میں اکثر وبیشتر شیعوں کے عقائد پر رکیک حملے ہوتے تھے اور ایسے اشعار ہوتے تھے جن سے شہیدان کربلا کا وقار بھی مجروح ہوتا تھا۔ یہی نہیں تعزیوں کے ساتھ لال رنگ کے کپڑے اور زرق برق لباس پہننے کو بھی بڑھاوا دیا گیا تاکہ محرم کا سوگوارانہ ماحول ایک میلے میں بدل کر رہ جائے۔ اس بات پر شیعوں کا ناراض ہونا فطری تھا انھوں نے انگریز سرکار سے کہا کہ لال پیلے کپڑے پہن کر آنے والے افراد کو تالکٹورہ کی کربلا میں آنے سے روکا جائے۔

شیعہ سنّی تنازعہ کی ابتداء

۱۹۰۵ء میں تالکٹورہ کی کربلا کے چاروں طرف میلہ لگنے پر شیعوں کے اعتراض کے سبب دونوں فرقوں کے بیچ فساد کی نوبت آگئی تو ۱۹۰۶ء میں ۶ مارچ کو انجمن امامیہ کی درخواست پر حکومت نے کربلا تالکٹورہ کے چاروں طرف میلہ لگائے جانے پر پابندی لگادی سرکاری حکم میں کہا گیا تھا کہ لال پیلے کپڑے پہنے ہوئے یا پان کھاتے ہوئے لوگ کربلا تالکٹورہ نہیں جاسکیں گے بلکہ وہی عاشور کے دن کربلا جاسکیں گے جو کالے کپڑوں میں ملبوس اور ننگے سر اور ننگے پیر اس طرح جارہے ہوں گے۔

ڈپٹی کمشنر کا یہ حکم سنّی فرقہ کو بہت ناگوار گزرا ۱۰ مارچ ۱۹۰۶ء کے اخبار النجم نے لکھا ہے "ڈپٹی کمشنر نے شیعوں کی مرضی کے مطابق یہ شرط لگادی کہ کربلا تالکٹورہ جانے والے لوگوں کے لئے ننگے پیر اور بغیر ٹوپی کے ہونا لازمی ہوگا اس پر سنّی فرقہ نے دوسری کربلا کی مانگ کی جو مان لی گئی اور سنّیوں نے اس بار اپنے تعزیہ موسیٰ باغ کے نزدیک دفن کئے اس طرح فساد ٹل

گیا۔"

۱۰ مارچ ۱۹۰۶ء کا اخبار ڈیلی اودھ بھی اس واقع کے سلسلے میں یوں رقمطراز ہے "اس سال ہندوؤں اور سنّیوں نے اپنے تعزیہ جناتوں کی مسجد کے میدان میں دفن کئے جبکہ شیعوں نے روائتی طریقے سے انھیں تالکٹورہ کی کربلا میں ہی دفن کیا۔ شیعہ چاہتے تھے کہ کربلا جانے والے لوگ ننگے پیر اور بنا ٹوپی کے ہوں اور پان نہ کھائیں۔ جو سنّیوں نے منظور نہیں کیا۔ اور نتیجہ میں دوسری کربلا چنی گئی اس سے آپس میں تناؤ پیدا ہو گیا"

۱۹۰۶ء میں کربلائیں الگ ہوئیں تو دونوں فرقوں کے جلوسوں کا وقت بھی بدل گیا۔ عاشور کے دن شیعوں کے جلوس صبح سے دوپہر تک اور سنّیوں کے جلوس دوپہر سے شام تک اٹھتے اسی طرح چہلم کے جلوس سنّی صبح سے دوپہر تک اٹھاتے اور شیعوں کے جلوس دوپہر سے شام تک اٹھتے۔

اپریل ۱۹۰۷ء میں چہلم کے موقع پر اسی وجہ سے فساد ہو گیا۔ سوداگر کے امام باڑے (جوہری محلّہ) سے اٹھنے والا شیعہ جلوس جب چوک میں پہنچا تو وہاں سنّیوں کا جلوس تاخیر ہو جانے کے باعث موجود تھا اس پر کہا سنی ہو گئی اور پھر فساد ہو گیا جس میں کئی لوگوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ اس فساد کے بعد برٹش سرکار نے باقاعدہ ایک فائل ہی اس سلسلے میں کھول دی جو آج بھی اترپردیش اسٹیٹ آرکاوز کے دفتر میں موجود ہے۔

اجتماعی تبدیلی مذہب

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ایک طرف تو شیعہ سنّی قضیہ منھ پھاڑے کھڑا تھا وہیں دوسری طرف اچھوت سمجھے جانے والے پسماندہ ذات کے افراد شیعہ مذہب کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ ۱۹۰۵ اور ۱۹۰۷ کے دوران خاندان اجتہاد کے جید عالم دین مولانا آقا حسن صاحب کے ہاتھوں پر سینکڑوں دلتوں نے اسلام قبول کر لیا تو ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ تبدیلی مذہب کے بعد ان دلتوں نے اپنی ماتمی انجمنیں بھی بنالیں اور مولانا آقا حسن صاحب جیسے بڑے عالم دین کے ساتھ

ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا تو مسلمانوں نے ہی ہائیو اویلا مچائی ۱۶ اپریل ۱۹۰۷ء کا اخبار 'جادو' لکھتا ہے ''شیعوں نے مہتروں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا ہے اور مہتروں نے اپنے برتن کنویں میں ڈال کر پانی نکالنا شروع کر دیا ہے اس پر ہندوؤں اور سنّیوں کو کڑا اعتراض ہے۔ ایک مہتر نے ترکاری کی دوکان بھی کھول لی ہے اس لعنت کو روکا جانا چاہیے'' کے اجتماعی تبدیلی مذہب کے معاملے کو ۱۹۰۷ء کے شیعہ سنّی فساد سے کافی نقصان بھی رہا اور دلتوں نے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ روک سا دیا۔

چار یاری جلوس کی مانگ

۱۹۰۸ء میں برٹش سرکار نے سنّیوں کی مانگ کے پیش نظر چار یاری جلوس کی اجازت دینے کے سلسلے میں ٹی سی پگٹ آئی سی ایس کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی۔ شیعوں نے اس کمیٹی کے سامنے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ سنّیوں کا ایک فرقہ محرم کے سوگوارانہ ماحول کو جشن میں بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کربلا کے شہیدوں پر نوحہ خوانی کرنے کے بجائے خلفائے ثلاثہ کی مدح سرائی والے نغمے گانا چاہتا ہے تعزیہ کی جگہ جھنڈے نکالنا چاہتا ہے یہی نہیں شیعوں کا کہنا تھا کہ چار یاری نظموں کی آڑ میں شیعوں کی عقائد پر بھی حملے کئے جاتے ہیں۔

پگٹ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ محرم کے جلوس کے درمیان خلفائے ثلاثہ کی مدح کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کمیٹی کا خیال تھا کہ اس طرح کی تحریک محض شیعوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لئے چلائی جا رہی ہے۔ پگٹ کمیٹی نے محرم، چہلم اور ۲۱ رمضان کے جلوسوں میں چار یاری نظمیں پڑھے جانے پر پابندی لگانے کی سفارش کی۔ برٹش سرکار نے کمیٹی کی سفارشوں کو تسلیم کرتے ہوئے چار یاری نظموں کو پڑھے جانے پر پابندی لگا دی۔

۱۸ جنوری ۱۹۰۹ء کو سنّیوں نے سرکاری حکم کی خلاف ورزی کر کے چار یاری جلوس نکالنے کی کوشش کی مگر لفٹیننٹ گورنر سر جیمس منٹسن کے کڑے رخ اور برٹش حکومت کی

طرف سے پگٹ کمیٹی کی سفارشات تسلیم کر لئے جانے کے باعث جلوس نہیں نکل سکا۔ اس کے بعد بھی کئی بار سنّیوں نے جلوس نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پگٹ کمیٹی رپورٹ کے بعد شیعوں اور سنّیوں کے بیچ اخبار بازی پمفلٹ بازی مناظرہ بازی اور ایک دوسرے کی عقائد کی بخیہ ادھیڑنے کی مہم چھڑ گئی۔

۱۹۰۹ء میں ہی کچھ ہندو شہریوں کی کوشش سے شیعہ اور سنّی علماء آمنے سامنے مناظرہ کے لئے تیار ہو گئے اور اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ شیعوں کی طرف سے مولانا سبط حسن اور سنّیوں کی طرف سے مولوی عبدالشکور بحث مباحثہ میں حصہ لینگے لکھنؤ کی فضا اس مناظرہ بازی سے خراب نہ ہو اس لئے امروہہ کو اس کے لئے چنا گیا۔ اس مناظرہ میں بذات خود شریک رہے مولانا ظفر الحسن وزن لکھنوی نے (جن کا تقریباً ایکسو پانچ سال کی عمر میں چند برس قبل انتقال ہوا ہے) مجھے بتایا کہ دونوں طرف سے کئی لوگ اس میں شامل تھے مگر گفتگو صرف مولانا سبط حسن اور مولوی عبدالشکور کے مابین چل رہی تھی باقی لوگ صرف ریفرنس کے لئے کتابیں کھول کر ان میں سے اقتباسات پیش کر رہے تھے۔

گفتگو کے دوران مولانا سبط حسن صاحب نے خلیفہ سوئم حضرت عثمان کے بارے میں ایک ایسا جملہ کہا جس پر مولوی عبدالشکور برافراختہ ہو کر مناظرہ سے اٹھ کر چلے گئے۔ شیعوں نے سمجھا کہ شائد دوسرے دن لوٹ کر آئیں گے لیکن مولوی عبدالشکور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لکھنؤ لوٹ چکے تھے اور یہاں انھوں نے سنّیوں کی جیت اور شیعوں کی شکست کے بڑے بڑے پوسٹر بھی چھپوا کر لگا دئے تھے۔ لکھنؤ کے شیعوں کے گھروں میں کہرام تھا دو دن کے انتظار کے بعد جب شیعہ دفد امروہہ سے واپس ہوا تو اس کو چارباغ اسٹیشن پر ہی سنّیوں کی فتح کے پوسٹر نظر آئے تب ان کی سمجھ میں آیا کہ ان سے غلطی کہاں ہوئی اور مولانا عبدالشکور کا انتظار کئے بغیر ہی ان کو اسی دن لکھنؤ لوٹ آنا چاہئے تھا۔ دوسرے دن شیعوں کی جانب سے پوسٹر لگ گئے اور اس میں اصل واقعہ بتا گیا اس طرح یہ مناظرہ بھی بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہو گیا اور اس اکتا دینے والی بحث کے بعد بھی نہ تو تمام شیعوں کو سنّی بنایا جا سکا نہ تمام سنّیوں کو شیعہ بنایا جا سکا۔

تعزیہ داری کے خلاف مہم

ناکام مناظرہ اور پگٹ کمیٹی کی رپورٹ سے مایوس ہو جانے کے بعد مولانا عبدالشکور نے لکھنؤ کی سرحد کے باہر تعزیہ داری کے خلاف اپنی تحریک شروع کردی اور کئی قصبوں کا ماحول خراب کرنے کی کوشش کی مگر جھنڈے کا جلوس اٹھانے کے بجائے تعزیوں کے آگے چاریاری نظمیں پڑھنا شروع کردیں۔ یہ بھی عجب بات ہے کہ مولانا عبدالشکور تعزیہ کو بدعت اور چاریاری جھنڈے کو عین عبادت سمجھتے تھے۔ اور ایک بدعت (اپنے خیال میں) کو ختم کرنے کے لئے دوسری بدعت کو شروع کرنا عین ایمان سمجھتے تھے۔ یہی چیز ایک ایسی تھی جو مولانا عبدالشکور کو وہابیوں سے الگ کرتی ہے وہابیوں کو نظر میں نہ تو تعزیہ نکالنے کی اجازت ہے نہ جلوس محمدی مگر مولانا عبدالشکور نے بہت چالاکی کے ساتھ تعزیہ داری کو ختم کرنے کے لئے جھنڈے کو بلند کیا تا کہ لوگ ان کو وہابی نہ کہہ سکیں۔ مشہور شاعر جوش ملیح آباد نے اپنی کتاب یادوں کی بارات میں تعزیہ اور جھنڈے کا قصہ بہت دلچسپ انداز میں لکھا ہے جس سے مولانا عبدالشکور کی تحریک پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ جوش صاحب لکھتے ہیں "یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے کہ ہماری ضریح جب بازار کے چوراہے تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ مولوی عبدالشکور کے چند گرگے، ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھنا چاہتے ہیں (جھنڈا پڑھنے کی وضاحت کرتے ہوئے حاشیہ میں جوش لکھتے ہیں "اس فعل کو اس بنا پر جھنڈا کہا جاتا تھا کہ :۔ چار سو جھنڈا اگڑا ہے چاریار پاک کا سے اس کا آغاز ہوتا تھا۔ اور یہ شوشہ چھوڑا تھا فرنگی (انگریزوں) نے تا کہ شیعہ سنّی لڑتے رہیں۔ حکومت نے ایک طرف دہلی کے شیعہ مولوی مقبول احمد کو تبرہ بازی اور دوسری طرف لکھنؤ کے ایک سنّی مولوی عبدالشکور کی جھنڈا بازی پر مامور کر دیا تھا وہ شیعوں کو تبرے پر اکساتے تھے یہ سنّیوں کو جھنڈے پر ابھارتے اس غداری کے صلہ میں دونوں گھر بیٹھے وظیفہ کھاتے تھے۔ فرنگی فقط ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو نہیں لڑاتا بلکہ ہندوؤں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے بھی لڑاتا تھا۔ ادھر آریہ سماج اور سناتن دھرمیوں ادھر سنّیوں اور شیعوں کو ایک دوسرے کی خونریزی پر للکارتا تھا۔ ارے فرنگی کا

رونا کیوں روئیں اپنے ہی دام کھوٹے تو پر کھنے والے کو کیا دوش؟ یہ مان لیا کہ وہ لڑاتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم لڑتے کیوں تھے؟

"عبث یہ ٹوہ ہے، کیڑے پڑے کیوں؟ میں تم سے پوچھتا ہوں تم سڑے کیوں؟جوش ملیح آبادی کا پورا گھرانہ کٹر سنّی تھا وہ خود بھی شروع شروع میں سنّی ہی تھے لیکن یہ لوگ تعزیہ داری کا اہتمام دوسرے سنّیوں کی طرح بڑے تزک واحتشام سے کرتے تھے۔ اور مولوی عبدالشکور کے دل میں یہی پھانس تھی کہ شیعہ جو کریں سو کریں سنّی تعزیہ داری کیوں کرتے ہیں؟جوش صاحب آگے لکھتے ہیں "ہمارے خاندان کے کچھ لوگ بھی ان کی (جھنڈا پڑھنے والوں کی) پشت پناہی پر آمادہ تھے۔ میں بھی لونڈا تھا یہ سن کر میرا خون کھول گیا اور میں نے بڑے طنطنے کے ساتھ پکار کر کہا کس کے منھ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ ہماری ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھے؟، اگر ایسا کوئی سورما ہے تو سامنے آئے اور اپنے حمایتیوں کو بھی ساتھ لائے۔

میری اس للکار پر چند افراد کے شانوں میں جنبش پیدا ہو گئی اور غضب کی شکنیں ماتھوں پر ابھر آئیں اور ایک کم روسا آدمی ایک صاحب کا اشارہ پا کر جھنڈا پڑھنے کو ضریح کے سامنے آگیا۔ میں نے ابرار کو اشارہ کیا انھوں نے جھپٹ کر اس کی بوکڑ کی سی داڑھی پکڑی۔ اور اس کے کالے سے منھ پر تڑاق سے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ اس کے حمایتوں میں کھلبلی مچ گئی اور شور برپا ہو گیا کہ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ اتنے میں عالم گیر پھپھا جن کی دور دور تک دھاک بیٹھی ہوئی تھی مجمع کو چیرتے ہوئے ضریح کے سامنے آگئے۔ انھوں نے اپنے ڈنڈے کو زمین پر کھٹکھٹا کر کہا آپ لوگ لڑکوں سے جھگڑا کر رہے ہیں بشیر احمد خاں (جوش کے والد) کے پاس جائے ضریح ان کی ہے وہ اگر اجازت دے دیں تو جھنڈا پڑھئے۔ لوگوں نے پھپھا کی بات مان لی اور سیدھے میرے باپ کے پاس گئے۔ تھوڑی دیر میں میرے باپ نے سپاہی بھیج کر مجھکو طلب فرمایا تو میں ضریح کے اردگرد کے سپاہیوں کو یہ حکم دے کر کہ جب تک میں نہ آؤں ضریح یہاں سے جنبش نہ کرے اور کسی کو جھنڈا پڑھنے کی اجازت نہ دی جائے، اپنے باپ کی جناب میں سر جھکائے پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کہا تم نے جھنڈا روک دیا ہے میں نے کہا "جی ہاں میاں"

انھوں نے فرمایا ''کیوں''؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ میاں پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے حسین آباد اسکول کے ہم جماعت شیعہ لڑکے میرے بلانے سے یہاں شریک ہونے آئے ہیں اگر ان کے منھ پر جھنڈا پڑھا گیا تو ان مہمانوں کی دل شکنی ہو گی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ دادی جان شیعہ ہیں جب وہ سنیں گی کہ ان کی ضریح کے سامنے جھنڈا بازی ہوئی ہے تو ان کے دل کو دھکا لگے گا اور تیسری بات یہ ہے کہ میاں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ امام حسین کی شہادت سے جھنڈے کا تعلق کیا ہے۔ جنازے کے ساتھ رونا پیٹنا ہوتا ہے یا لوگوں کی تعریف جھنڈے پڑھے جاتے ہیں؟

میاں نے سیدھے ہو کر ان لوگوں کے چہروں کی جانب نگاہ اٹھائی جو میری شکایت لے کر آئے تھے اور مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا شبیر تم معقول بات کہہ رہے ہو یہ فرما کر میاں اٹھ کھڑے ہوئے ان کے اٹھتے ہی تمام حاضرین اور سپاہی بھی کھڑے ہو گئے۔ اور کمرے سے نکلتے ہوئے ارشاد فرمایا میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ ایسا کون سا دنت ہے کہ ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھنے کی جسارت کر سکے۔ اس کے بعد کسی کی مجال تھی کہ میرے باپ کے سامنے جھنڈا پڑھا جاتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جھنڈا تو پڑھا نہیں جا سکا۔ لیکن میری ''رافضیت'' جھنڈے پر چڑھ گئی۔

مدح صحابہ اور تبرّا کا جھنجھٹ

دونوں فرقوں کی کربلائیں الگ ہونے سے مولانا عبدالشکور کو جو کامیابی ملی تھی اس سے وہ زیادہ مطمئن نہیں تھے کیونکہ وہ تو عزاداری بند کروانے اور تعزیہ داری کو ختم کرنے کے ارادے سے ہی میدان میں اترے تھے۔ وہ تعزیہ داری کو تو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے لیکن فرنگی محل کے علماء کو کنارے کر کے سنّوں کی لیڈر شپ اپنے ہاتھ میں لے لینے میں پوری طرح کامیاب ہو چکے تھے انھوں نے مدح صحابہ کے نام سے سنّیوں کو ایک نئی تحریک دے کر بہت کامیابی حاصل کر لی تھی۔

۱۹۳۲ء ۳۳ء میں مولانا حسین احمد مدنی نے احرار پارٹی کی بنیاد ڈالی احراری تحریک کی طرف سے بھی مولانا عبدالشکور کے مومنٹ کو بہت فائدہ پہنچایا گیا۔ احراری پارٹی کے لوگ محرم کے دنوں میں لال کپڑے پہن کر نکلتے جس سے شیعوں کی دل آزاری ہوتی تھی حالانکہ احرار پارٹی کا شیعہ سنّی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ آزادئی ملک کی بات کرتے تھے لیکن مولانا حسین احمد مدنی بھی مولانا عبدالشکور کے حمایتی بن گئے تاکہ سنّیوں میں مقبولیت حاصل کی جا سکے۔

۱۹۳۵ء میں انگریزوں نے روز بروز بڑھتی شیعہ سنّی منافرت پر غور کرنے اور شیعہ سنّی مسائل کو حل کرنے کے لئے السپ کمیٹی بٹھائی مگر السپ کمیٹی بھی معاملہ کو حل نہیں کر سکی اور مدح صحابہ کے جلوس کی نئی مانگ پر اس نے بھی سنیوں کے حق میں کوئی فیصلہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس بیچ لکھنؤ کے شیعہ یہی سمجھنے لگے کہ احراری ہی تعزیہ داری کے اصل دشمن ہیں ڈپٹی علی اکبر مرحوم کے صاجزادے علی سرور مرحوم کی ایک ڈائری مجھے اپنے عزیزوں سے ملی تو اس میں اس زمانے کے بہت سے شیعہ سنّی جھگڑوں کی کافی تفصیل موجود تھی۔

۲۴ مارچ ۱۹۳۷ء کے صفحہ پر علی سرور صاحب لکھتے ہیں کہ "آج بیگم گنج اور یحیٰ گنج میں احراریوں نے دو سنّی تعزیہ داروں کے تعزیوں میں آگ لگادی جس سے شہر میں تناؤ پھیل گیا کئی لوگ گرفتار بھی ہوئے دوسرے دن کالا تعزیہ اٹھانے والے سنّیوں نے سرکار سے اپنے تحفظ کی مانگ کی اور تعزیہ کا جلوس چہلم کے دن اٹھائے جانے کا اعلان کیا"

۲۵ مارچ ۱۹۳۷ء کو دس محرم کی شاہی ضریح جب حسین آباد سے چوک پہنچی تو نیم کے ایک پیڑ کی ڈال راستے میں آگئی اس کو کاٹے جانے پر شیعوں نے اصرار کیا اور سنّیوں نے نیم کی شاخ کاٹے جانے کی مخالفت کی جس پر تناؤ ہو گیا لیکن اس تناؤ اور احراریوں کی مخالفت کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں سنّیوں نے اس سال تالکٹورہ آکر تعزیہ دفن کئے۔"

علی سرور صاحب کی تحریر سے لگتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سنی حضرات حکومت کی طرف سے لگائی گئی پابندی کو بھول گئے تھے اور شیعہ حضرات بھی سنّیوں کو محض کپڑوں کے

رنگ کی وجہ سے تالکٹورہ نہ آنے دینے کی ضد بھی چھوڑ چکے تھے۔ عزاداری کے جلوس بند ہونے سے قبل تک ہزاروں سنّی حضرات کو اپنے تعزیوں کے ساتھ کربلا تالکٹورہ میں آتے ہوئے خود ہم لوگوں نے بھی دیکھا ہے۔ مولانا عبدالشکور نے سنّیوں کو تعزیہ داری سے روکنے میں ناکامی محسوس کی تو اپنی تحریک کا رخ بدل کر انھوں نے جلوس مدح صحابہ کا نیا نعرہ دیا۔

مدح صحابہ کیا ہے:۔

ویسے تو مدح صحابہ کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ صحابہ کی تعریف و توصیف و ستائش ظاہر ہے یہ سنّیوں کا پیدائشی حق ہے اور دنیا بھر میں وہ لوگ صحابہ کی تعریف و توصیف کرتے بھی ہیں لیکن لکھنؤ میں مولانا عبدالشکور صاحب نے جس چیز کو مدح صحابہ کہا وہ تبرے کی ایک دوسری شکل ہے۔ مدح صحابہ میں پڑھے جانے والے اشعار میں صرف صحابہ کی مدح نہیں ہوتی بلکہ اس میں شیعوں کے عقائد پر لعن طعن ان کو جہنمی اور کافر تک کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے یہاں تک کہ ایسے اشعار بھی کہے جاتے ہیں جس سے اہلبیت اطہار کا مرتبہ کم ہوتا ہے اور شہیدان کربلا کی توہین ہوتی ہے۔ مگر مولوی عبدالشکور صاحب نے مدح صحابہ کا لیبل لگا کر جو تجارت شروع کی تھی اس میں اختلاف کا زہر ہلاہل بیچا جارہا تھا۔ اور مسلمانوں کو آپس میں لڑوا کر اسلام کی جڑیں کھودی جارہی تھیں یہی نہیں مدح صحابہ میں حضرت علی کی اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والے شام کے گورنر امیر معاویہ کی مدح زیادہ ہوتی جن کو شیعہ بالکل پسند نہیں کرتے ہیں کیونکہ امیر شام نے حضرت علی کے ساتھ معرکہ آرائی کے علاوہ حضرت امام حسن سے جو صلح نامہ تحریر کیا تھا اس کی شرائط کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے حکومت اپنے اوباش اور عیاش و بدکار بیٹے یزید کے حوالے کردی تھی۔ مولانا عبدالشکور کی رائج کردہ مدح صحابہ تو کہیں کہیں یزید کی مدح و ثناء کی حد تک پہنچ گئی تھی ظاہر ہے شیعہ فرقہ سب کچھ برداشت کرسکتا ہے کربلا کے شہیدوں کی توہین یا یزید کی مدح و ثناء برداشت نہیں کرسکتا۔

جلوس مدح صحابہ کی تحریک کی ابتداء

۱۹۳۷ء میں مدح صحابہ کے جلوس لی مانگ کو لیکر مولانا عبدالشکور صاحب کے ساتھیوں نے احرارپاٹی کے ساتھ مل کر برٹش سرکار پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ٹیلے والی مسجد پر مدح صحابہ کے جلوس کا مطالبہ کرنے والوں کا ایک جلسہ منے خاں نامی سنّی لیڈر کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں سرکار کو متنبہ کیا گیا کہ اگر اگلے جمعہ تک مدح صحابہ کے جلوس کی اجازت نہیں دی گئی تو وہ جیل بھرو تحریک شروع کر دینگے۔

مگر سرکار نے اجازت نہیں دی سات جنوری ۱۹۳۸ء کو ٹیلے پر احراریوں اور مسلم لیگی کارکنوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا کیونکہ احراری یہ نہیں چاہتے تھے کہ ٹیلے والی مسجد کے احاطہ میں محمد علی جناح اور راجہ محمود آباد جیسے شیعوں کے لئے زندہ باد کے نعرے لگائے جائیں بلکہ مدح صحابہ زندہ باد کے نعرے لگائے جائیں۔ اس مارپیٹ کے بعد احراریوں اور لیگیوں کا جلوس الگ الگ نکلا۔ دس دن بعد یعنی ۱۷ جنوری کو سنّیوں نے مدح صحابہ کے نام پر عام ہڑتال کا نعرہ دیا اور امین آباد پارک میں جلسہ کرنے کے بعد کونسل ہاؤس پہنچے جہاں مسلم لیگ کے کارکنوں سے مدح صحابہ پارٹی کا جھگڑا ہو گیا بعد میں گوند بلبھ پنت نے سنّیوں سے کہا کہ مدح سبھا کے معاملہ پر ان کی صوبائی حکومت دو مہینے میں کوئی فیصلہ کر لے گی مگر سنّیوں نے تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء میں سنّیوں نے جیل بھرو تحریک شروع کی۔

۲۹ جنوری کو مشہور سنّی لیڈر مولانا عطاءاللہ شاہ نے سنّیوں کے ایک جلسے میں تقریر کی اور کہا کہ ملک کی آزادی کی تحریک کامیاب ہونے تک مدح صحابہ کی تحریک کو ختم کر دیا جانا چاہئے مگر اس پر مولانا عبدالشکور کے حامی اور احرار پارٹی کے ممبران برافروختہ ہو گئے اور مارپیٹ پر آمادہ ہو گئے ان لوگوں نے مولانا عطاءاللہ شاہ کو بھی زدوکوب بھی کیا۔ کچھ دن تک شیعہ سنّی محاذ پر خاموشی رہنے کے بعد ۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو وزیر گنج کے علاقہ میں مدح صحابہ کی مانگ کرنے والے سنّیوں اور شیعوں کے مابین تشدد پھوٹ پڑا مگر اتلاف جان نہیں ہوا۔ ۲۸ مارچ کو گوند بلبھ پنت

نے سنّیوں سے کئے گئے وعدے کے مطابق یہ فیصلہ سنادیا کہ سنّیوں کو اپنے اپنے گھروں میں مدح صحابہ کا حق حاصل ہے لیکن شارع عام پر اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس اعلان سے سنّیوں کو بہت گہرا صدمہ پہنچا۔

کشمیری شیعوں کے نوحہ پر جھگڑا

پانچ اپریل ۱۹۳۸ء کو پانچ کشمیری نوجوانوں کو حاکم شامی لعین است والا نوحہ پڑھنے پر گرفتار کیا گیا کیونکہ اس کو برٹش سرکار نے تبرہ قرار دیا تھا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو چہلم کے موقع پر گولہ گنج کے مقبرہ عالیہ سے کشمیریوں کا قدیم جلوس علم برآمد ہوا اور اپنے قدیمی راستے پاٹا نالہ سے گزرا تو سنّیوں نے زبردست پتھراؤ کر دیا کیونکہ جلوس کے شرکاء فارسی کا وہی قدیم نوحہ پڑھ رہے تھے جس پر سنّیوں کو اعتراض تھا۔ پتھراؤ کے بعد فساد شہر کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گیا چھ لوگ اسی دن ہلاک اور لاتعداد مجروم ہوئے بعد میں کئی لوگ ہسپتال میں بھی چل بسے۔ اس فساد کے بعد مولانا عبدالشکور اور ان کے سب ہی ساتھیوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

شیعوں کی سینا

بڑھتے ہوئے فسادات اور شیعوں کی جان و مال پر ہو رہے حملے اور چار یاری و احراری سنّیوں سے لڑنے کے لئے شیعوں نے سپاہ عباسیہ کے نام سے ایک فوجی دستہ قائم کر کے اپنے عزائم کا اظہار کر دیا اس سینا کا پہلا مارچ ۲۴ اگست ۱۹۳۸ء کو آغا باقر کے امام باڑے سے درگاہ حضرت عباس تک ہوا جس میں چار ہزار شیعہ نوجوانوں نے لیفٹیننٹ سلطان علی خاں کی قیادت میں حصہ لیا اور شہر میں اپنی دھاک بٹھادی۔ ادھر تو سپاہ عباسیہ جیسے فوجی دستے بن رہے تھے اور مولانا عبدالشکور کے ہمنوا اور سرخ پوش احراری لشکر کشی کی تیاری میں تھے تو دوسری جانب مسلم لیگ شیعہ سنّی اتحاد کی کوششوں میں لگی تھی۔ ۲۶ اگست ۱۹۳۸ء کو مسلم لیگ نے یوم فلسطین کا انعقاد کیا اور فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف امین آباد پارک میں ایک عظیم الشان

جلسہ کیا جس میں شیعہ سنّی جھگڑا مٹائے جانے پر بھی زور دیا گیا۔

پہلا ہندو مسلم جھگڑا

لکھنؤ شیعہ سنّی جھگڑوں میں لاکھ گھرا رہا تھا لیکن یہاں ہندو مسلم کے مابین رشتے بہت اچھے تھے اور ایودھیا میں ہنومان گڑھی کے مندر مسجد قضیہ کے دوران بھی یہاں فساد نہیں ہوا تھا لیکن ۲۲ جنوری ۱۹۳۹ء کو ہندوؤں نے حیدر آباد ڈے منایا تو مولوی گنج میں جلوس پر حملہ کے بعد فساد ہو گیا جس میں کئی ہندو نیتا زخمی ہو گئے۔ اس حملہ کے خلاف گنیش گنج میں دس ہزار ہندوؤں نے اپنے گھروں سے باہر آکر احتجاج کیا مگر سمجھدار شہریوں کے بیچ میں پڑنے کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن گیارہ فروری کو پڑوسی شہر کانپور میں زبردست فساد پھوٹ پڑا جس میں بے شمار لوگ ہلاک ہو گئے اور کروڑوں روپے کی املاک برباد کی گئی۔ مگر ان فسادات سے بے خبر اور مسلمانوں کی ہلاکتوں سے بے نیاز مولانا عبدالشکور نے صرف دس دن بعد ۲۱ فروری ۱۹۳۹ء کو مدح صحابہ کی تحریک شروع کر دی اور مدح صحابہ پڑھتے ہوئے گرفتاریاں دینا شروع کیں۔

۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء کو پاٹانالہ کے قریب کشمیری شیعوں کے جلوس پر پابندی عائد کی گئی کہ صرف دو سو لوگ ہی جلوس میں جائیں گے مگر شیعہ بضد تھے کہ سب ہی شرکاء پاٹانالہ سے گزاریں گے بعد میں ڈپٹی کمشنر نے شیعوں کو اپنے بھرپور مجمع کے ساتھ جلوس میں جانے کی اجازت دے دی شیعوں نے پھر وہی نوحہ پڑھا جس پر پچھلے سو برس سے جھگڑا ہوتا آرہا تھا مگر اس بار فساد نہیں ہوا کیونکہ مولانا عبدالشکور اور ان کے سب ہی ساتھی مدح صحابہ کی تحریک میں جیل جا چکے تھے۔

۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو کانگریس کی صوبائی سرکار نے سنّیوں کا دل جیتنے کی غرض سے بارہ وفات کے موقع پر (جس کو اب عید میلادالنبی کہا جاتا ہے) مدح صحابہ کا جلوس نکالنے کی اجازت دے دی حالانکہ کئی اہم کانگریسی رہنما مدح صحابہ کا جلوس دئے جانے کے خلاف تھے۔ سینئر کانگریسی لیڈر رفیع احمد قدوائی نے بھی گوند بلبھ پنت کو باز رہنے کا مشورہ دیا مگر وہ نہ مانے۔ روزنامہ مون لائٹ نے اپنے اپنی ٦ مئی ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں سنی بیرسٹر این یو اے صدیقی کا ایک بیان